بازارِحیات

JOIN
Friendskorner.com/Forum
Entertainment
Jokes
Urdu shayeri
Tv Dramas
Designed shayeri
Political Talk shows
Video recipes
much more

بہت پیارے

گلزار

کے نام

جو فلمی ہدایت کاری، گیت

نگاری اور مکالمہ نویسی میں غیر

فانی شہرت رکھنے کے علاوہ ایک

بڑے افسانہ نگار بھی ہیں

www.FriendsKorner.com/Forum

ترتیب

پرمشیر سنگھ	4
مخبر	19
بابا نور	28
موچی	31
ہیرا	41

FRIENDS KORNER
FRIENDSKORNER.COM

پرمیشر سنگھ

اختر اپنی ماں سے یوں اچانک بچھڑ گیا جیسے بھاگتے ہوئے کسی کی جیب سے روپیہ گر پڑے، ابھی تھا اور ابھی غائب۔ ڈھنڈیا پڑی مگر بس اس حد تک کہ لٹے پٹے قافلے کے آخری سرے پر ایک ہنگامہ صابن کے جھاگ کی طرح اٹھا اور بیٹھ گیا۔ ''کہیں آ ہی رہا ہوگا۔'' کسی نے کہہ دیا۔ ''ہزاروں کا تو قافلہ ہے۔'' اور اختر کی ماں اس تسلی کی لاٹھی تھامے پاکستان کی طرف رینگتی چلی آئی تھی۔ ''آ ہی رہا ہوگا۔'' وہ سوچتی۔ ''کوئی تتلی پکڑنے نکل گیا ہوگا۔ اور پھر ماں کو نہ پا کر رویا ہوگا اور پھر۔۔۔ پھر اب کہیں آ ہی رہا ہوگا۔ سمجھ دار ہے۔ پانچ سال سے تو کچھ اوپر ہو چلا ہے۔ آ جائے گا۔ وہاں پاکستان میں ذرا ٹھکانے سے بیٹھوں گی تو ڈھونڈ لوں گی۔''

لیکن اختر تو سرحد سے کوئی پندرہ میل ادھر یونہی، بس کسی وجہ کے بغیر اتنے بڑے قافلے سے کٹ گیا تھا۔ اپنی ماں کے خیال کے مطابق اس نے تتلی کا تعاقب کیا یا کسی کھیت میں سے گنا توڑنے گیا اور توڑتا رہ گیا۔ بہر حال وہ روتا چلاتا ایک طرف بھاگا جا رہا تھا تو چند سکھوں نے اسے گھیر لیا تھا اور اختر نے طیش میں آ کر کہا تھا۔ ''میں نعرہ تکبیر مار دوں گا'' ۔۔۔۔۔ اور یہ کہہ کہ سہم گیا تھا۔

سب سکھ بے اختیار ہنس پڑے تھے۔ سوائے ایک سکھ کے جس کا نام پرمیشر سنگھ تھا۔ ڈھیلی ڈھالی پگڑی میں سے اس کے الجھے ہوئے کیس جھانک رہے تھے۔ اور جوڑا تو بالکل ننگا تھا۔ وہ بولا ''ہنسو نہیں یار۔'' اس بچے کو بھی اسی واہگورو جی نے پیدا کیا ہے۔ جس نے تمہیں اور تمہارے بچوں کو پیدا کیا۔''

''مارو نہیں یارو۔'' پرمیشر سنگھ کی آواز میں پکار تھی۔ ''اسے مارو نہیں۔'' اتنا ذرا سا تو ہے اور اس بھی تو اسی واہگورو جی نے پیدا کیا ہے جس نے۔۔۔۔''

''پوچھ لیتے ہیں اسی سے۔'' ایک اور سکھ بولا۔ پھر اس نے سہمے ہوئے اختر کے پاس جا کر کہا۔ ''بولو۔ تمہیں کس نے پیدا کیا؟ خدا نے کہ واہگورو جی نے؟''

اختر نے اس ساری خشکی کو نگلنے کی کوشش کی جو اس کی زبان کی نوک سے لے کر اس کی ناف تک پھیل چکی تھی۔ آنکھیں جھپک کر اس نے ان آنسوؤں کو گرا دینا چاہا جو ریت کی طرح اس کے پپوٹوں میں کھٹک رہے تھے۔ اس نے پرمیشر سنگھ کی طرف یوں دیکھا جیسے ماں کو دیکھ رہا ہے۔ منہ میں گئے ہوئے ایک آنسو کو تھوک ڈالا اور بولا۔

''پتہ نہیں۔''

''لو اور سنو۔'' کسی نے کہا اور اختر کو گالی دے کر ہنسنے لگا۔

اختر نے ابھی اپنی بات پوری نہیں کی تھی۔ بولا۔ ''ماں تو کہتی ہے میں بھوسے کی کوٹھڑی میں پڑا ملا تھا۔''

سب سکھ ہنسنے لگے پر میشر سنگھ بچوں کی طرح بلبلا کر کچھ یوں رویا کہ دوسرے سکھ بھونچکا سے رہ گئے اور پرمیشر سنگھ رونی آواز میں جیسے بین کرنے لگا۔ ''سب بچے ایک سے ہوتے ہیں یارو۔ میرا کرتارا بھی تو یہی کہتا تھا۔ وہ بھی تو اس کی ماں کو بھوسے کی کوٹھڑی میں پڑا ملا تھا۔''

کرپان میان میں چلی گئی۔ سکھوں نے پرمیشر سنگھ سے الگ تھوڑی دیر کھسر پھسر کی۔ پھر ایک سکھ آگے بڑھا۔ بلکتے ہوئے اختر کو بازو سے پکڑے وہ چپ چاپ روتے ہوئے پرمیشر سنگھ کے پاس آیا اور بولا۔ لے پرمیشرے، سنبھال اسے۔ کیس بڑھوا کر سے اپنا کرتارا بنالے۔ لے پکڑ۔"

پرمیشر سنگھ نے اختر یوں جھپٹ کر اٹھا لیا کہ اس کی پگڑی کھل گئی اور کیسوں کی لٹیں لٹکنے لگیں۔ اس نے اختر کو پاگلوں کی طرح چوما۔ اسے اپنے سینے سے بھینچا اور پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اور مسکرا مسکرا کر کچھ ایسی باتیں سوچنے لگا جنھوں نے اس کے چہرے کو چمکا دیا۔ پھر اس نے پلٹ کر دوسرے سکھوں کی طرف دیکھا۔ اچانک وہ اختر کو نیچے اتار کر سکھوں کی طرف لپکا۔ مگر ان کے پاس سے گزر کر دور تک بھاگا چلا گیا۔

جھاڑیوں کے ایک جھنڈ میں بندروں کی طرح کودتا اور جھپٹتا رہا اور اس کے کیس اس کی لپک جھپٹ کا ساتھ دیتے رہے۔ دوسرے سکھ حیران کھڑے اسے دیکھتے رہے پھر وہ ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر رکھے بھاگا ہوا واپس آیا۔ اس کی بھیگی ہوئی داڑھی میں پھنسے ہوئے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور سرخ آنکھوں میں چمک تھی اور وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔

اختر کے پاس آکر وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور بولا۔ "نام کیا ہے تمہارا؟"

"اختر" اب کے اختر کی آواز بھرائی ہوئی نہیں تھی۔

"اختر بیٹے۔" پرمیشر سنگھ نے بڑے پیار سے کہا۔ ذرا میری انگلیوں میں سے جھانکو تو!"

"اختر ذرا سا جھک گیا۔ پرمیشر سنگھ نے دونوں ہاتھوں میں ذرا سی جھری پیدا کی اور فوراً بند کر لی۔ "آہا!" اختر نے تالی بجا کر اپنے ہاتھوں کو پرمیشر سنگھ کے ہاتھوں کی طرح بند کر لیا اور آنسوؤں میں مسکرا کر بولا۔ "تتلی!"

"لو گے؟" پرمیشر سنگھ نے پوچھا۔

"ہاں!" اختر نے اپنے ہاتھوں کو ملایا۔

"لو" پرمیشر سنگھ نے اپنے ہاتھوں کو کھولا۔ اختر نے تتلی پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ راستہ پاتے ہی اڑ گئی۔ اور اختر کی انگلیوں کی پوروں پر اپنے پروں کے رنگوں کے ذرے چھوڑ گئی۔ اختر اداس ہو گیا۔ اور پرمیشر سنگھ دوسرے سکھوں کی طرف دیکھ کر بولا۔

"سب بچے ایک سے کیوں ہوتے ہیں یارو! کرتارے کی تتلی بھی اڑ جاتی تھی تو یوں ہی منہ لٹکا لیتا تھا۔"

"پرمیشر سنگھ تو آدھا پاگل ہو گیا ہے۔" نوجوان سکھ نے ناگواری سے کہا اور پھر سارا گروہ واپس جانے لگا۔

"پرمیشر سنگھ نے اختر کو کندھے پر بٹھا لیا اور جب اسی طرف چلنے لگا جدھر دوسرے سکھ گئے تھے تو اختر پھڑک پھڑک کر رونے لگا۔ "ہم اماں کے پاس جائیں گے۔ اماں کے پاس جائیں گے۔"

پرمیشر سنگھ نے ہاتھ اٹھا کر اسے تھپکنے کی کوشش کی مگر اختر نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ پھر جب پرمیشر سنگھ نے یہ کہا کہ۔ "ہاں، ہاں بیٹے، تمہیں تمہاری ماں کے پاس ہی لئے چلتا ہوں۔" تو اختر چپ ہو گیا۔ صرف کبھی کبھی سسک لیتا تھا اور پرمیشر سنگھ کو بڑی ناگواری سے

برداشت کرتا جا رہا تھا۔

پرمیشر سنگھ اسے اپنے گھر میں لے آیا۔ پہلے یہ کسی مسلمان کا گھر تھا۔ لٹا پٹا پرمیشر سنگھ جب ضلع لاہور سے ضلع امرتسر میں آیا تھا تو گاؤں والوں نے اسے یہ مکان الاٹ کر دیا تھا۔ وہ اپنی بیوی اور بیٹی سمیت جب اس چار دیواری میں داخل ہوا تو ٹھٹک کر رہ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں پتھرا سی گئیں تھیں۔ اور وہ بڑی پراسرار سرگوشی میں بولا تھا۔ یہاں کوئی چیز قرآن پڑھ رہی ہے!"

گرنتھی جی اور گاؤں کے دوسرے لوگ ہنس پڑے تھے۔ پرمیشر سنگھ کی بیوی نے انہیں پہلے سے بتا دیا تھا کہ کرتار سنگھ کے بچھڑتے ہی اسے کچھ ہو گیا ہے۔ "جانے کیا ہو گیا ہے اسے!" اس نے کہا تھا۔ "واہگورو جی جھوٹ نہ بلوائیں تو وہاں دن میں کوئی دس بار تو یہ کرتار کو گدھوں کی طرح پیٹ ڈالتا تھا۔ اور جب کرتار سنگھ سے بچھڑا ہے تو میں تو خیر رو دھو لی پر اس کا رونے سے بھی جی ہلکا نہیں ہوا۔ وہاں مجال ہے جو بیٹی امر کور کو میں بھی ذرا غصے سے دیکھ لیتی، بپھر جاتا تھا۔ کہتا تھا۔ "بیٹی کو برا مت کہو، بیٹی بڑی مسکین ہوتی ہے۔ یہ تو ایک مسافر ہے بیچاری۔ ہمارے گھروندے میں ستانے بیٹھ گئی ہے۔ وقت آئے گا تو چلی جائے گی۔۔۔۔۔ اور اب امر کور سے ذرا سا بھی کوئی قصور ہو جائے تو آپے ہی میں نہیں رہتا۔ یہ تک بک دیتا ہے کہ بیٹیاں بیویاں اغوا ہوتی سنی تھیں یارو۔ یہ نہیں سنا تھا کہ پانچ چھ برس کے بیٹے بھی اٹھ جاتے ہیں۔"

وہ ایک مہینے سے اس گھر میں مقیم تھا۔ مگر ہر رات اس کا معمول تھا کہ پہلے سوتے میں بے تحاشہ کروٹیں بدلتا۔ پھر بڑبڑانے لگتا اور پھر اٹھ بیٹھتا۔ بڑی ڈری ہوئی سرگوشی میں بیوی کے کہتا۔ "سنتی ہو؟ یہاں کوئی چیز قرآن پڑھ رہی ہے!" بیوی اسے محض "اونہہ" سے ٹال کر سو جاتی تھی مگر امر کور کو اس سرگوشی کے بعد رات بھر نیند نہ آتی۔ اسے اندھیرے میں بہت سی پرچھائیاں ہر طرف قرآن پڑھتی نظر آتیں اور پھر جب ذرا سی پو پھوٹتی تو وہ کانوں میں انگلیاں دے لیتی تھی۔ وہاں ضلع لاہور میں ان کا گھر مسجد کے پڑوس ہی میں تھا۔ اور جب صبح اذان ہوتی تھی تو کیسا مزا آتا تھا۔ ایسا لگتا تھا، جیسے پورب سے پھوٹتا ہوا اجالا گانے لگا ہے۔ پھر جب اس کی پڑوسن پرتیم کور کو چند نوجوانوں نے خراب کر کے چیتھڑے کی طرح گھورے پر پھینک دیا تو جانے کیا ہوا کہ موذن کی آواز میں بھی اسے پرتیم کور کی چیخ سنائی دے جاتی تھی۔ اذان کا تصور تک اسے خوفزدہ کر دیتا تھا۔ اور وہ یہ بھول جاتی تھی کہ اب ان کے پڑوس میں مسجد نہیں ہے۔

یونہی کانوں میں انگلیاں دیئے ہوئے وہ سو جاتی اور رات بھر جاگتے رہنے کی وجہ سے سن چڑھے تک سوئی رہتی اور پرمیشر سنگھ اس بات پر بگڑ جاتا۔ "ٹھیک ہے سوئے نہیں تو اور کیا کرے نکمی، تو ہوتی ہیں یہ چھوکریاں۔ لڑکا ہوتا تو اب تک جانے کتنے کام کر چکا ہوتا یارو۔"

پرمیشر سنگھ آنگن میں داخل ہوا تو آج خلاف معمول اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اس کے کھلے کیس کنگھے سمیت اس کی پیٹھ اور ایک کندھے پر بکھرے ہوئے تھے اور اس کا ایک ہاتھ اختر کی کمر تھپکے جا رہا تھا۔ اس کی بیوی ایک طرف بیٹھی چھاج میں گندم پھٹک رہی تھی۔ اس کے ہاتھ جہاں تھے وہیں رک گئے اور وہ ٹکر ٹکر پرمیشر سنگھ کو دیکھنے لگی۔ پھر وہ چھاج پر سے کودتی ہوئی آئی اور بولی۔ "یہ کون ہے؟"

پرمیشر سنگھ بدستور مسکراتے ہوئے بولا۔ "ڈرو نہیں بے وقوف اس کی عادتیں بالکل کرتارے کی سی ہیں۔ یہ بھی اپنی ماں کو بھوسے کی کوٹھڑی میں پڑا ملا تھا۔ یہ بھی تتلیوں کا عاشق ہے۔ اس کا نام اختر ہے۔"

''اختر۔'' بیوی کے تیور بدل گئے۔

تم اسے اختر سنگھ کہہ لینا۔'' پرمیشر سنگھ نے وضاحت کی۔'' اور پھر کیسوں کا کیا ہے۔ دنوں میں بڑھ جاتے ہیں۔ کڑا اور کچھیرا پہنا دو۔ کنگھا کیسوں کے بڑھتے ہی لگ جائے گا۔

''پر یہ ہے کس کا؟'' بیوی نے مزید وضاحت چاہی۔

''کس کا ہے!'' پرمیشر سنگھ نے اختر کو کندھے پر سے اتار کر اسے زمین پر کھڑا کر دیا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔'' واہگورو جی کا ہے۔ ہمارا اپنا ہے۔ اور پھر یارو۔ یہ عورت اتنا بھی نہیں دیکھ سکتی کہ اختر سے ماتھے پر جو یہ ذرا سا تل ہے۔ یہ کرتارے ہی کا تل ہے۔ کرتارے کے بھی تو ایک تل تھا اور یہیں تھا۔ ذرا بڑا تھا پر ہم اسے یہیں تل پر ہی تو چومتے تھے اور یہ اختر کے کانوں کی لویں گلاب کے پھول کی طرح گلابی ہیں تو یارو۔ یہ عورت یہ تک نہیں سوچتی کہ کرتارے کے کانوں کی لویں بھی تو ایسی ہی تھیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ ذرا موٹی تھیں۔ یہ ذرا پتلی ہیں اور۔۔۔۔۔۔۔''

اختر اب تک مارے حیرت کے ضبط کئے بیٹھا تھا۔ بلبلا اٹھا۔'' ہم یہاں نہیں رہیں گے۔ ہم اماں کے پاس جائیں گے۔ اماں پاس۔''

پرمیشر سنگھ نے اختر کا ہاتھ پکڑ کر اسے بیوی کی طرف بڑھایا۔'' اری لو، یہ اماں پاس جانا چاہتا ہے۔''

''تو جائے۔'' بیوی کی آنکھوں میں اور چہرے پر وہی آسیب آ گیا تھا جسے کرتار سنگھ اپنی آنکھوں اور چہرے میں سے نوچ کر باہر کھیتوں میں جھٹک آیا تھا۔'' ڈاکہ مارنے گیا تھا سورما۔ اور اٹھا لایا یہ ہاتھ بھر کا لونڈا۔ ارے کوئی لڑکی ہی اٹھا لاتا تو ہزار میں نہ سہی ایک دو سو میں تو بک جاتی۔ اس اجڑے گھر کا کھاٹ کھٹولا بن جاتا۔ اور پھر۔۔۔۔ پگلے۔۔۔۔۔۔ تجھے تو کچھ ہو گیا ہے۔ دیکھتے نہیں یہ لڑکا مسلا ہے؟ جہاں سے اٹھا لائے ہو وہیں ڈال آؤ۔ خبردار جو اس نے میرے چوکے میں پاؤں رکھا۔''

پرمیشر سنگھ نے التجا کی۔'' کرتارا اور اختر کو ایک ہی واہگورو جی نے پیدا کیا ہے۔ سمجھیں؟''

''نہیں۔'' اب کے بیوی چیخ اٹھی۔'' میں نہیں سمجھی، نہ کچھ سمجھنا چاہتی ہوں، میں رات ہی رات جھٹکا کر ڈالوں گی اس کا۔ کاٹ کر پھینک دوں گی۔ اٹھا لایا ہے وہاں سے۔۔۔۔۔۔ لے جا اسے، پھینک دے باہر۔''

''تمہیں نہ پھینک دوں باہر؟'' اب کے پرمیشر سنگھ بگڑ گیا۔'' تمہارا نہ کر ڈالوں جھٹکا؟'' وہ بیوی کی طرف بڑھا۔ اور بیوی اپنے سینے کو دو ہتڑوں سے پیٹتی، چیختی چلاتی بھاگی۔ پڑوس اس امر کو دوڑی آئی۔ اس کے پیچھے گلی کی دوسری عورتیں بھی آ گئیں۔ مرد بھی جمع ہو گئے اور پرمیشر سنگھ کی بیوی پٹنے سے بچ گئی۔ پھر سب نے اسے سمجھایا کہ نیک کام ہے۔ ایک مسلمان کو سکھ بنانا کوئی معمولی کام نہیں۔ پرانا زمانہ تو اب تک پرمیشر سنگھ گرو مشہور ہو چکا ہوتا۔ بیوی کی ڈھارس بندھی مگر امر کور ایک کونے میں بیٹھی گھٹنوں میں سر دیئے روتی رہی۔ اچانک پرمیشر سنگھ کی گرج نے سارے ہجوم کو دہلا دیا۔'' اختر کدھر گیا؟'' وہ چنگھاڑا۔'' ارے وہ کدھر گیا ہمارا اختر۔ ارے وہ تم میں سے کسی قصائی کے ہتھے تو نہیں چڑھ گیا یارو۔ اختر، اختر!'' چیختا ہوا مکان کے کونوں کھدروں میں جھانکتا ہوا باہر بھاگ گیا۔ بچے مارے دلچسپی کے اس کے تعاقب

میں تھے اور عورتیں چھتوں پر چڑھ گئی تھیں۔ اور پرمیشر سنگھ گلیوں میں سے باہر کھیتوں میں نکل گیا تھا۔ ''ارے میں تو اسے اماں کے پاس لے چلتا یارو۔ ارے وہ کہاں گیا۔ ''اختر اے اختر۔''

''میں تمہارے پاس نہیں آؤں گا۔'' پگڈنڈی کے ایک موڑ پر، گیان سنگھ کے گنے کے کھیت کی آڑ سے، روتے ہوئے اختر نے پرمیشر سنگھ کو ڈانٹ دیا۔ ''تم تو سکھ ہو۔''

''ہاں بیٹے سکھ تو ہوں۔'' پرمیشر سنگھ نے جیسے مجبور ہو کر اعتراف جرم کر لیا۔

''تو پھر ہم نہیں آئیں گے۔'' اختر نے پرانے آنسوؤں کو پونچھ کر نئے آنسوؤں کے لئے راستہ صاف کیا۔

''نہیں آؤ گے؟'' پرمیشر سنگھ کا لہجہ اچانک بدل گیا۔

''نہیں۔''

''نہیں آؤ گے؟''

''نہیں، نہیں۔ نہیں۔''

''کیسے نہیں آؤ گے؟'' پرمیشر سنگھ نے اختر کو کان سے پکڑا اور پھر نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دبا کر اس کے منہ پر چٹاخ سے ایک تھپڑ مار دیا۔ ''چلو۔'' وہ کڑکا۔

اختر یوں سہم گیا جیسے ایک دم اس کا سارا خون نچڑ کر رہ گیا ہے۔ پھر ایکا ایکی وہ زمین پر گر کر پاؤں پٹخنے اور خاک اڑانے اور بلک بلک کر رونے لگا۔ ''نہیں چلتا۔ بس نہیں چلتا۔ تم سکھ ہو۔ میں سکھوں کے پاس نہیں جاؤں گا۔ میں اپنی اماں کے پاس جاؤں گا۔ میں تمہیں مار دوں گا۔''

اور جیسے اب پرمیشر سنگھ کے سہمنے کی باری تھی۔ اس کا بھی سارا خون جیسے نچڑ کر رہ گیا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ کو دانتوں میں جکڑ لیا۔ اس کے نتھنے پھڑکنے لگے اور پھر اس زور سے رو دیا کہ کھیت کی پرلی مینڈھ پر آتے ہوئے چند پڑوسی اور ان کے بچے سہم کر رہ گئے۔ اور ٹھٹک گئے۔ پرمیشر سنگھ گھٹنوں کے بل اختر کے سامنے بیٹھ گیا۔ بچوں کی طرح یوں سسک سسک کر رونے لگا کہ اس کا نچلا ہونٹ بھی بچوں کی طرح لٹک آیا اور بچوں کی سی رونی آواز میں بولا۔ ''مجھے معاف کر دے اختر مجھے تمہارے خدا کی قسم، میں تمہارا دوست ہوں۔ تم اکیلے یہاں سے جاؤ گے تو تمہیں کوئی مار دے گا پھر تمہاری ماں پاکستان سے آ کر مجھے مارے گی۔ میں خود جا کر تمہیں پاکستان چھوڑ آؤں گا۔ سنا؟ سن رہے ہونا؟ پھر وہاں اگر تمہیں ایک لڑکا مل جائے نا۔ کرتارا نام کا تو تم اسے ادھر اس گاؤں میں چھوڑ جانا اچھا؟''

''اچھا۔'' اختر نے الٹے ہاتھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے پرمیشر سنگھ سے سودا کر لیا۔ پرمیشر سنگھ نے اختر کو کندھے پر بٹھا لیا اور چلا گیا مگر ایک قدم ہی اٹھا کر رک گیا۔ سامنے بہت سے بچے اور چند پڑوسی اس کی تمام حرکات دیکھ رہے تھے۔ ادھیڑ عمر کا ایک پڑوسی بولا۔ ''روتے کیوں ہو پرمیشرے، کل ایک مہینے کی بات ہے، ایک مہینے میں اس کے کیس بڑھ آئیں گے تو بالکل کرتارا لگے گا۔''

کچھ کہے بغیر وہ تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔ پھر ایک جگہ رک کر اس نے پلٹ کر اپنے پیچھے آنے والے پڑسیوں کی طرف دیکھا۔ ''تم

کتنے ظالم لوگ ہو یارو۔اختر کو کرتارا بناتے ہو اور اگر ادھر کوئی کرتارے کو اختر بنا لے؟ اسے ظالم ہی کہو گے نا؟'' پھر اس کی آواز میں گرج آ گئی۔''یہ لڑکا مسلمان ہی رہے گا۔دربار صاحب کی سوں۔میں کل ہی امرتسر جا کر اس کے انگریزی بال بنوالاؤں گا۔تم نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے۔خالصہ ہوں۔سینے میں شیر کا دل ہے، مرغی کا نہیں۔''

پرمشیر سنگھ اپنے گھر میں داخل ہو کر ابھی اپنی بیوی اور بیٹی کو اختر کی مدارت کے سلسلے میں احکام ہی دے رہا تھا کہ گاؤں کا سردار سنتو کھ سنگھ اندر آیا۔اور بولا۔

''پرمشیر سنگھ!''

''جی'' پرمیشر سنگھ نے پلٹ کر دیکھا۔گرنتھی جی پیچھے اس کے سب پڑوسی بھی تھے۔

''دیکھو۔'' گرنتھی جی نے بڑے دبدبے سا کہا۔''کل سے یہ لڑکا خالصے کی پگڑی باندھے گا۔کڑا پہنے گا۔دھرم شالہ آئے گا اور سے پرساد کھلایا جائے گا۔''اس کے کیسوں کو قینچی نہیں چھوئے گی۔چھوگئی تو کل ہی سے یہ گھر خالی کر دو۔سمجھے؟''

''جی۔'' پرمیشر سنگھ نے آہستہ سے کہا۔

''ہاں!'' گرنتھی جی نے آخری ضرب لگائی۔

''ایسا ہی ہو گا گرنتھی جی۔'' پرمشیر سنگھ کی بیوی بولی۔''پہلے ہی اسے راتوں کو گھر کے کونے کونے سے کوئی چیز قرآن پڑھتی سنائی دیتی ہے،لگتا ہے پہلے جنم میں مسلا رہ چکا ہے۔امرکور بیٹی نے جب سے یہ سنا ہے کہ ہمارے گھر میں مسلا چھوکرا آیا ہے تو بیٹھی رو رہی ہے۔کہتی ہے گھر پر کوئی اور آفت آئے گی۔پرمشیر نے آپ کا کہنا نہ مانا تو میں بھی دھرم شالہ چلی آؤں گی۔اور امرکور بھی۔پھر یہ پڑا اس چھوکرے کو چاٹے،موا نکما، واہگورو جی کا بھی لحاظ نہیں کرتا۔''

واہگورو جی کا کون لحاظ نہیں کرتا گدھی۔'' پرمشیر سنگھ نے گرنتھی جی کی بات کا غصہ بیوی پر نکالا۔پھر وہ دیر تک زیر لب گالیاں دیتا رہا۔کچھ دیر کے بعد وہ اٹھ کر گرنتھی جی کے سامنے آ گیا۔۔۔''اچھا جی، اچھا۔''اس نے کہا۔اور کچھ یوں کہا کہ گرنتھی جی پڑوسیوں کے ساتھ فوراً رخصت ہو گئے۔

چند ہی دنوں میں اختر دوسرے سکھ لڑکوں سے پہچاننا مشکل ہو گیا۔وہی کانوں کی لووں تک کس کے بندھی ہوئی پگڑی۔وہی ہاتھ کا کڑا اور وہی کچھیرا۔صرف جب وہ گھر میں آ کر پگڑی اتارتا تھا۔تو اس کے غیر سکھ ہونے کا راز کھلتا تھا۔لیکن اس کے بال دھڑا دھڑ بڑھ رہے تھے۔پرمشیر سنگھ کی بیوی ان بالوں کو چھو کر بہت خوش ہوتی تھی۔

''ذرا ادھر تو آ امرکورے! یہ دیکھ کیسے بن رہے ہیں۔پھر ایک دن جوڑا بنے گا۔کنگھا لگے گا اور اس کا نام رکھا جائے گا کرتار سنگھ۔''

''نہیں ماں'' امرکور وہیں سے جواب دیتی۔''جیسے واہگورو جی ایک ہیں اور گرنتھی صاحب ایک ہیں، اور چاند ایک ہے۔اسی طرح کرتارا بھی ایک ہے۔میرا ننھا منا بھائی۔''

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیتی اور مچل کر کہتی۔''اس کھولنے سے نہیں بہلوں گی ماں۔میں جانتی ہوں یہ مسلا ہے اور جو کرتارا ہوتا ہے

وہ مسلا نہیں ہوتا۔“

”میں کب کہتی ہوں کہ یہ سچ مچ کا کرتارا ہے۔ میرا چاند سالاڈلا بچہ۔“ پرمشیر سنگھ کی بیوی رو دی۔ دونوں اختر کو اکیلا چھوڑ کر کسی گوشے میں بیٹھ جاتیں۔ خوب خوب روتیں۔ ایک دوسرے کو تسلیاں دیتیں۔ اور پھر زار زار رونے لگتیں۔ وہ اپنے کرتارے کے لئے روتیں۔ اختر چند روز اپنی اماں کیلئے روتا رہا۔ اب کسی اور بات پر روتا۔ جب پرمشیر سنگھ شرنارتھیوں کی امدادی پنچائیت سے کچھ غلہ یا کپڑا لے کر آتا تو اختر بھاگ کر جاتا اس کی ٹانگوں سے لپٹ جاتا اور رو رو کر کہتا۔ میرے سر پر پگڑی باندھ دو پرموں۔ میرے کیس بڑھا دو، مجھے کنگھا خرید دو۔“

پرمشیر سنگھ اسے سینے سے لگا لیتا اور بھرائی ہوئی آواز میں کہتا۔ ”یہ سب ہو جائے گا بچے۔ سب کچھ ہو جائے گا۔ پر ایک بات نہیں ہوگی۔ وہ بات کبھی نہیں ہوگی وہ نہیں ہوگا مجھ سے سمجھے؟ یہ کیس ویس سب بڑھ آئیں گے۔“

اختر اپنی اماں کو بہت کم یاد کرتا تھا۔ جب تک پرمشیر سنگھ گھر میں رہتا وہ اس سے چمٹا رہتا اور جب وہ کہیں باہر جاتا تو اختر اس کی بیوی اور امر کور کی طرف یوں دیکھتا رہتا جیسے ان سے ایک ایک پیار کی بھیک مانگ رہا ہے۔ پرمیشر سنگھ کی بیوی اس نہلاتی، اس کے کپڑے دھوتی اور پھر اس کے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے رونے لگتی۔ اور روتی رہ جاتی۔ البتہ امر کور نے اختر کی طرف جب بھی دیکھا ناک اچھا دی۔ شروع شروع میں تو اس نے اختر کو ایک دھوکا بھی جڑ دیا تھا۔ مگر جب اختر نے پرمشیر سنگھ سے اس کی شکایت کی تو پرمیشر سنگھ بپھر گیا۔ اور امر کور کو بڑی ننگی ننگی گالیاں دیتا اس کی طرف یوں بڑھا کہ اگر اس کی بیوی راستے میں اس کے پاؤں نہ پڑ جاتی تو وہ اپنی بیٹی کو اٹھا کر دیوار سے گلی میں پٹخ دیتا۔ ”الو کی پٹھی۔“ اس روز اس نے کڑک کر کہا تھا۔ ”سنا تو یہی تھا کہ لڑکیاں اٹھ رہی ہیں پر یہاں یہ مشٹنڈی ہمارے ساتھ لگی چلی آئی اور اٹھ گیا تو پانچ سال کا لڑکا جسے ابھی اچھی طرح ناک تک پونچھنا نہیں آتا۔ عجیب اندھیر ہے یارو۔“ اس واقعے کے بعد امر کور نے اختر پر ہاتھ تو خیر کبھی نہ اٹھایا مگر اس کی نفرت دو چند ہو گئی۔

ایک روز اختر کو تیز بخار آ گیا۔ پرمشیر سنگھ وید کے پاس چلا گیا۔ اور اس کے جانے کے کچھ دیر بعد اس کی بیوی پڑوسن سے پسی ہوئی سونف مانگنے چلی گئی۔ اختر کو پیاس لگی۔ ”پانی۔“ اس نے کہا۔ پھر کچھ دیر کے بعد اس نے لال لال سوجی سوجی آنکھیں کھولیں ادھر ادھر دیکھا اور پانی“ کا لفظ ایک کراہ بن کر اس کے حلق سے نکلا۔ کچھ دیر کے بعد وہ لحاف کو ایک طرف جھٹک کر اٹھ بیٹھا۔ امر کور سامنے دہلیز پر بیٹھی کھجور کے پتوں سے چنگیر بنا رہی تھی۔ ”پانی دے!“ اختر نے اسے ڈانٹا۔ امر کور نے بھویں سکیڑ کر اسے گھور کر دیکھا اور اپنے کام میں جٹ گئی۔ اب کے اختر چلایا۔ ”پانی دیتی ہے کہ نہیں۔ پانی دے ورنہ میں ماروں گا۔“ ۔۔۔۔۔ امر کور نے اب کے اس کی طرف دیکھا ہی نہیں۔ بولی۔ ”مار تو سہی۔“ تو کرتارا نہیں کہ میں تیری مار سہ لوں گی۔ میں تو تیری بوٹی بوٹی کر ڈالوں گی۔“

اختر بلک بلک کر رو دیا اور آج مدت کے بعد اس نے اپنی ماں کو یاد کیا۔ پھر جب پرمیشر سنگھ دوا لے آیا اور اس کی بیوی بھی پسی ہوئی سونف لے کر آ گئی تو اختر نے روتے روتے بری حالت بنا لی تھی اور وہ سسک سسک کر کہہ رہا تھا۔ ”ہم تو اب اماں کے پاس چلیں گے۔ یہ امر کور سور کی بچی تو پانی بھی نہیں پلاتی۔ ہم تو اماں کے پاس چلیں گے۔“ پرمشیر سنگھ نے امر کور کی طرف غصے سے دیکھا۔ وہ رو رہی تھی۔ اور

اپنی ماں سے کہہ رہی تھی۔ ”کیوں پانی پلاؤں کرتارا ابھی تو کہیں اسی طرح پانی مانگ رہا ہوگا۔ کسی سے۔ کسی کو اس پر ترس نہ آئے تو ہمیں کیوں ترس آئے اس پر ماں۔“

پرمیشر سنگھ کی بیوی جلدی سے ایک پیالہ بھر کر لائی تو اختر نے پیالے کو دیوار پر دے مارا۔ اور چلایا۔ تمہارے ہاتھ سے نہیں پئیں گے۔ تم امر کور سور کی بچی کی ماں ہو۔ ہم تو پرموں کے ہاتھ سے پئیں گے۔“

”یہ بھی تو مجھی سور کی بچی کا باپ ہے!“ امر کور نے جل کر کہا۔

”تو ہوا کرے!“ اختر بولا۔ ”تمہیں اس سے کیا۔“

پرمشیر سنگھ کے چہرے پر عجیب کیفیتیں دھوپ چھاؤں سی پیدا کر گئیں۔ وہ اختر کے مطالبے پر مسکرایا بھی اور رو بھی دیا۔ پھر اس نے اختر کو پانی پلایا۔ اس کے ماتھے کو چوما۔

اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ اسے بستر پر لٹا کر اس کے سر کو ہولے سے کھجاتا رہا اور کہیں شام کو جا کر اس نے پہلو بدلا۔ اس وقت اختر کا بخار اتر چکا تھا۔ اور وہ بڑے مزے سے سو رہا تھا۔

آج بہت عرصے کے بعد رات کو پرمشیر سنگھ بھڑک اٹھا اور نہایت آہستہ سے بولا۔

”اری سنتی ہو؟“ سن رہی ہو؟ یہاں کوئی چیز قرآن پڑھ رہی ہے۔“

بیوی نے پہلے تو اسے پرمشیر سنگھ کی پرانی عادت کہہ کر ٹالنا چاہا مگر پھر ایک دم بڑبڑا کر اٹھی اور امر کور کی کھاٹ کی طرف ہاتھ بڑھا کر اسے ہولے ہولے سے ہلا کر آہستہ سے بولی۔ ”بیٹی۔“

”کیا ہے ماں۔“ امر کور چونک اٹھی۔

اور اس نے سرگوشی کی۔ ”سنو تو۔ سچ مچ کوئی چیز قرآن پڑھ رہی ہے۔“

یہ ایک ثانیے کا سناٹا بڑا خوفناک تھا۔ امر کور کی چیخ اس سے بھی زیادہ خوفناک تھی۔ اور پھر اختر کی چیخ خوفناک تر تھی۔

”کیا ہوا بیٹا؟“ پرمشیر سنگھ تڑپ کر اٹھا اور اختر کی کھاٹ پر جا کر اسے اپنی چھاتی سے بھینچ لیا۔ ”ڈر گئے بیٹا؟“

”ہاں۔“ اختر لحاف میں سے سر نکال کر بولا۔ ”کوئی چیز چیخی تھی۔“

امر کور چیخی تھی۔“ پرمشیر سنگھ نے کہا۔ ”ہم سب یوں سمجھے جیسے کوئی چیز قرآن پڑھ رہی ہے۔“

”میں پڑھ رہا تھا۔“ اختر بولا۔

اب کے بھی امر کور کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

بیوی نے جلدی سے چراغ جلا دیا اور امر کور کی کھاٹ پر بیٹھ کر دونوں اختر کو یوں دیکھنے لگیں جیسے وہ ابھی دھواں بن کر دروازے کی جھریوں میں سے باہر اڑ جائے گا۔ اور باہر سے ایک ڈراؤنی آواز آئے گی۔ ”میں جن ہوں۔ میں کل رات پھر آ کر قرآن پڑھوں گا۔“

”کیا پڑھ رہے تھے بھلا؟“ پرمشیر سنگھ نے پوچھا۔

''پڑھوں؟''اختر نے پوچھا۔

''ہاں ہاں۔''پرمشیر سنگھ نے بڑے شوق سے کہا۔

اور اختر قل ھواللہ احد پڑھنے لگا۔کفواً احد پر پہنچ کر اس نے اپنے گریبان میں چھوکی اور پھر مسکرا کر پرمشیر سنگھ کی طرف دیکھا اور بولا۔''تمہارے سینے پر بھی چھو کر دوں۔''

''ہاں ہاں۔''پرمشیر سنگھ نے گریبان کا بٹن کھول دیا اور اختر نے چھو کر دی۔

اب کے امر کور نے بڑی مشکل سے چیخ پر قابو پایا۔

پرمشیر سنگھ بولا۔''کیا نیند نہیں آتی تھی؟''

''ہاں۔''اختر بولا۔''اماں یاد آ گئی۔اماں کہتی ہے۔نیند نہ آئے تو تین بار قل ھواللہ پڑھو۔نیند آ جائے گی۔اب آ رہی تھی پر امر کور نے ڈرا دیا۔''

''پھر سے پڑھ کر سو جاؤ۔''پرمشیر سنگھ نے کہا۔''روز پڑھا کرو۔اونچے اونچے پڑھا کرو۔اسے بھولنا نہیں رونہ تمہاری اماں مارے گی تمہیں۔لو اب سو جاؤ۔''اس نے اختر کو لٹا کر لحاف اوڑھا دیا۔پھر چراغ بجھانے کے لئے بڑھا تو امر کور پکاری۔''نہیں۔نہیں بابا۔''بجھاؤ نہیں۔ڈر لگتا ہے؟''

''ڈر لگتا ہے؟''پرمیشر سنگھ نے حیران ہو کر پوچھا۔''کس سے ڈر لگتا ہے؟''

''جلتا رہے۔کیا ہے؟''بیوی بولی۔

اور پرمشیر سنگھ دیا بجھا کر ہنس گیا۔پگلیاں۔''وہ بولا۔''گدھیاں۔''

رات کے اندھیرے میں اختر آہستہ آہستہ قل ھواللہ پڑھتا رہا۔پھر کچھ دیر کے بعد وہ ذرا ذرا سے خراٹے لینے لگا۔پرمیشر سنگھ بھی سو گیا اور اس کی بیوی بھی۔مگر امر کور رات بھر کچی نیند میں ''پڑوس'' کی مسجد کی اذان سنتی رہی اور ڈرتی رہی۔

اب اختر کے اچھے خاصے کیس بڑھ آئے تھے۔ننھے سے جوڑے میں کنگھا بھی اٹک جاتا تھا۔گاؤں والوں کی طرح پرمشیر سنگھ کی بیوی بھی اسے کرتارا کہنے لگی تھی۔اور اس سے خاصی شفقت سے پیش آتی تھی۔مگر امر کور اختر کو یوں دیکھتی تھی جیسے وہ کوئی بہروپیا ہے اور ابھی پگڑی اور کیسا اتار کر پھینک دے گا۔اور قل ھواللہ پڑھتا ہوا غائب ہو جائے گا۔''

ایک دن پرمشیر سنگھ بڑی تیزی سے گھر آیا اور ہانپتے ہوئے اپنی بیوی سے پوچھا۔وہ کہاں ہے؟''

''کون؟''امر کور؟''

''نہیں۔''

''کرتارا؟''

''نہیں۔''پھر کچھ سوچ کر بولا۔''ہاں ہاں وہی،کرتارا۔''

''باہر کھیلنے گیا ہے گلی میں ہوگا۔''

پرمشیر سنگھ واپس لپکا۔گلی میں جا کر بھاگنے لگا۔باہر کھیتوں میں جا کر اس کی رفتار اور تیز ہوگئی۔پھر اسے دور گیان سنگھ کے گنے کی فصل کے پاس چند بچے کبڈی کھیلتے نظر آئے۔کھیت کی اوٹ سے اس نے دیکھا کہ اختر نے ایک لڑکے کو گھٹنوں تلے دبا رکھا ہے۔لڑکے کے ہونٹوں سے خوف پھوٹ رہا ہے۔مگر کبڈی کبڈی کی رٹ جاری ہے۔پھر اس لڑکے نے جیسے ہار مان لی اور جب اختر کی گرفت سے چھوٹا تو بولا۔''کیوں بے کرتارو۔تم نے میرے منہ پر گھٹنا کیوں مارا؟''

''اچھا کیا جو مارا۔''اختر اکڑ کر بولا اور بکھرے ہوئے جوڑے کی لٹیں سنبھال کر ان میں کنگھا پھنسانے لگا۔

''تمہارے رسول نے تمہیں یہی سمجھایا ہے؟''لڑکے نے طنز سے پوچھا۔

اختر ایک لمحے کے لئے چکرا گیا۔پھر کچھ سوچ کر بولا۔''اور کیا تمہارے گرو نے تمہیں یہی سمجھایا ہے؟''

''مسلا۔''لڑکے نے اسے گالی دی۔

''سکھڑا۔''اختر نے گالی دی۔

سب لڑکے اختر پر ٹوٹ پڑے مگر پرمشیر سنگھ کی ایک ہی کڑک سے میدان صاف تھا۔اس نے اختر کی پگڑی باندھی اور اسے ایک طرف لے جا کر بولا۔''سنو بیٹے۔میرے پاس رہو گے کہ اماں کے پاس جاؤ گے؟''

اختر کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔کچھ دیر تک پرمیشر سنگھ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا رہا۔پھر مسکرانے لگا اور بولا۔''اماں کے پاس جاؤں گا۔''

''اور میرے پاس نہیں رہو گے؟''پرمیشر سنگھ کا رنگ یوں سرخ ہو گیا جیسے وہ رو دے گا۔

''تمہارے پاس بھی رہوں گا۔''اختر نے معمے کا حل پیش کر دیا۔پرمیشر سنگھ نے اسے اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔اور وہ آنسو جو مایوسی نے آنکھوں میں جمع کئے تھے خوشی کے آنسو بن کر ٹپک پڑے۔وہ بولا۔دیکھو بیٹے۔اختر بیٹے۔آج یہاں فوج آ رہی ہے۔یہ فوجی تمہیں مجھ سے چھیننے آ رہے ہیں۔سمجھے؟تم کہیں چھپ جاؤ۔جب وہ چلیں جائیں گے نا تو میں تمہیں لے آؤں گا۔''

پرمشیر سنگھ کو اس وقت دور غبار کا ایک پھیلتا ہوا بگولا دکھائی دیا۔مینڈھ پر چڑھ کر اس نے لمبے ہوتے ہوئے بگولے کو غور سے دیکھا اور اچانک تڑپ کر بولا۔''فوجیوں کی لاری آ گئی۔''۔۔۔۔۔۔۔وہ مینڈھ پر سے کود پڑا۔اور گنے کے کھیت کا پورا چکر کاٹ گیا۔''گیا اور گیان سنگھ!''وہ چلایا۔گیان سنگھ فصل کے اندر سے نکل کر آیا۔اس کے ایک ہاتھ میں درانتی اور دوسرے ہاتھ میں تھوڑی سی گھاس تھی۔پرمشیر سنگھ اسے الگ لے گیا۔اسے کوئی بات سمجھائی،پھر دونوں اختر کی طرف آئے۔گیان سنگھ نے فصل میں سے ایک گنا توڑ کر درانتی سے اس کے پتے کاٹے اور اسے اختر کے حوالے کر کے بولا۔''آؤ بھئی کرتارے۔تم میرے پاس بیٹھ کر گنا چوسو۔جب تک یہ فوجی چلے جائیں۔اچھا خاصا بنا بنایا خالصہ ہتھیانے آئے ہیں۔ہونہہ!''۔۔۔۔۔پرمشیر سنگھ نے اختر سے جانے کی اجازت مانگی۔''جاؤں؟''

اور اختر نے دانتوں میں گنے کا لمبا سے چھلکا جکڑے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی۔اجازت پا کر پرمشیر سنگھ گاؤں کی طرف

بھا گیا۔بگولا گاؤں کی طرف بڑھا آ رہا تھا۔

گھر جا کر اس نے بیوی اور بیٹی کو سمجھایا پھر بھا گم بھاگ گرنتھی جی کے پاس گیا۔ان سے بات کر کے ادھر ادھر دوسرے لوگوں کو سمجھاتا پھرا۔اور جب فوجیوں کی لاری دھرم شالہ سے ادھر کھیت میں رک گئی تو سب فوجی اور پولیس والے گرنتھی جی کے پاس آئے۔ان کے ساتھ علاقے کا نمبردار بھی تھا۔مسلمان لڑکیوں کے بارے میں پوچھ گچھ ہوتی رہی۔گرنتھی جی صاحب کی قسم کھا کر کہہ دیا کہ اس گاؤں میں کوئی مسلمان لڑکی نہیں۔

''لڑکے کی بات دوسری ہے۔''کسی نے پرمشیر سنگھ کے کان مین سرگوشی کی اور آس پاس کے سکھ پرمشیر سنگھ سمیت زیرلب مسکرانے لگے۔پھر ایک فوجی افسر نے گاؤں والوں کے سامنے تقریر کی۔اس نے مامتا پر بڑا زور دیا جوان ماؤں کے دلوں میں ان دنوں ٹیس بن کر رہ گئی تھی۔جب کی بیٹیاں چھن گئی تھیں۔اور ان بھائیوں اور شوہروں کے پیار کی بڑی دردناک تصویر کھینچی جن کی بیویاں ان سے ہتھیا لی گئیں تھیں۔''اور مذہب کا کیا ہے دوستو۔''اس نے کہا تھا۔

''دنیا کا ہر مذہب انسان کو انسان بننا سکھا تا ہے۔اور تم مذہب کا نام لے کر انسان کو انسان سے چرا لیتے ہو۔ان کی آبرو پر ناچتے ہو اور کہتے ہو ہم سکھ ہیں،ہم مسلمان ہیں۔ہم واہگورو جی کے چیلے ہیں،ہم رسول کے غلام ہیں۔''

سب سے پہلے گرنتھی جی پرمشیر سنگھ کو مبارک باد دی۔پھر دوسرے لوگوں نے پرمیشر سنگھ کو گھیر لیا اور اسے مبارک بادیں دینے لگے۔لیکن پرمشیر سنگھ لاری کے آنے سے پہلے حواس باختہ ہو رہا تھا اب لاری کے جانے کے بعد لٹا لٹا سا لگ رہا تھا۔پھر وہ گاؤں میں سے نکل کر گیان سنگھ کے کھیت میں آیا۔اختر کو کندھے پر بٹھا کر گھر میں لے آیا۔کھانا کھلانے کے بعد اسے کھاٹ پر لٹا کر کچھ یوں تھپکا کہ اسے نیند آ گئی۔پرمشیر سنگھ دیر تک اختر کی کھاٹ پر بیٹھا رہا۔کبھی کبھی داڑھی کھجاتا اور ادھر ادھر دیکھ کر پھر سوچ میں ڈوب جاتا۔پڑوس کی چھت پر کھیلتا ہوا ایک بچہ اچانک ایڑی پکڑ کر بیٹھ گیا اور زار زار رونے لگا۔

''ہائے اتنا بڑا کانٹا اتر گیا پورے کا پورا۔''وہ چلایا۔اور پھر اس کی ماں ننگے سر اوپر بھاگی۔

اسے اٹھا کر گود میں بٹھالیا۔پھر نیچے بیٹی کو پکار کر سوئی منگوائی۔کانٹا نکالنے کے بعد اسے بے تحاشا چوما اور پھر نیچے جھک کر پکاری۔''ارے میرا دوپٹہ تو اوپر پھینک دینا۔کیسی بے حیائی سے اوپر بھاگی چلی آئی۔''

پرمشیر سنگھ نے کچھ دیر کے بعد چونک کر اپنی بیوی سے پوچھا۔''سنو کیا تمہیں کرتارا اب بھی یاد آتا ہے۔''

''لو اور سنو۔''بیوی بولی۔اور پھر ایک دم چھاجوں رو دی۔کرتارا تو میرے کلیجے کا ناسور بن گیا ہے پرمشیرے۔''

کرتارے کا نام سن کر ادھر سے امر کور اٹھ کر آئی اور روتی ہوئی ماں کے گھٹنے کے پاس بیٹھ کر رونے لگی۔

پرمشیر سنگھ یوں بدک کر جلدی سے اٹھا جیسے اس نے شیشے کے برتنوں سے بھرا ہوا طشت اچانک زمین پر دے مارا ہے۔

شام کو کھانے کے بعد وہ اختر کو انگلی سے پکڑے باہر دالان میں آیا اور بولا۔''آج تو دن بھر خوب سوئے ہو بیٹا۔چلو آج ذرا گھومنے چلتے ہیں۔چاندنی رات ہے۔''

اختر فوراً مان گیا۔ پرمشیر سنگھ نے اسے ایک کمبل میں لپیٹا اور کندھے پر بٹھالیا۔ کھیتوں میں آ کر بولا۔ ''یہ چاند جو پورب سے نکل رہا ہے نا بیٹے۔ یہ جب ہمارے سر پر پہنچے گا تو صبح ہو جائے گی۔''

اختر چاند کی طرف دیکھنے لگا۔

''یہ چاند جو یہاں چمک رہا ہے نا۔ وہاں بھی چمک رہا ہوگا۔ تمہاری اماں کے دیس میں۔''

اب کے اختر نے جھک کر پرمشیر سنگھ کی طرف دیکھنے کی کوشش کی۔

''یہ چاند ہمارے سر پر آئے گا تو وہاں تمہاری اماں بھی چاند کو دیکھ رہی ہوگی۔''

''ہاں۔'' پرمشیر سنگھ کی آواز میں گونج تھی۔ ''چلو گے اماں کے پاس؟''

''ہاں۔'' اختر بولا۔ ''پر تم لے تو جاتے نہیں۔ تم بہت برے ہو۔ تم سکھ ہو۔''

پرمشیر سنگھ بولا۔ ''نہیں بیٹے۔ آج تو تمہیں ضرور ہی لے جاؤں گا۔ تمہاری اماں کی چھٹی آئی تھی۔ وہ کہتی ہے میں اختر بیٹے کے لئے اداس ہوں۔''

''میں بھی تو اداس ہوں۔'' اختر کو جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آ گئی۔

''میں تمہیں تمہاری اماں ہی کے پاس لے جا رہا ہوں۔''

''سچ؟'' اختر پرمیشر سنگھ کے کندھے پر کودنے لگا اور زور زور سے بولنے لگا۔ ''ہم اماں کے پاس جا رہے ہیں پرموں ہمیں اماں کے پاس لے جائے گا۔ ہم وہاں سے پرموں کو چھٹی لکھیں گے۔''

پرمشیر سنگھ چپ چاپ روئے جا رہا تھا۔ آنسو پونچھ کر اور گلا صاف کر کے اس نے اختر سے پوچھا۔ ''گانا سنو گے؟''

''ہاں۔''

''پہلے تم قرآن سناؤ۔''

''اچھا۔'' اور اختر قل ہو اللہ پڑھنے لگا۔ کفواً احد پر پہنچ کر اس نے اپنے سینے پر چھوکی اور بولا۔ ''لاؤ تمہارے سینے پر بھی چھو کر دوں۔''

رک کر پرمیشر سنگھ نے گریبان کا ایک بٹن کھولا اور اوپر دیکھا۔ اختر نے لٹک کر اس سینے پر چھو کر دی اور بولا۔ ''اب تم سناؤ۔''

پرمشیر سنگھ نے اختر کو دوسرے کندھے پر بٹھالیا۔ اسے بچوں کا کوئی گیت یاد نہیں تھا۔ اس لیے اس نے قسم قسم کے گیت گانا شروع کئے اور گاتے ہوئے تیز تیز چلنے لگا۔ اختر چپ چاپ سنتا رہا۔

بنتو دا سر بن ورگا جے

بنتو دا منہ چن ورگا جے

بنتو دا لک چترا جے

لوکو

بنتو دا لک چترا

''بنتو کون ہے؟'' اختر نے پرمشیر سنگھ کو ٹوکا۔

پرمشیر سنگھ ہنسا۔ پھر ذرا وقفے کے بعد بولا۔ میری بیوی ہے نا۔ امرکور کی ماں۔ اس کا نام بنتو ہے۔ امرکور کا نام بھی بنتو ہے۔ تمہاری اماں کا نام بھی بنتو ہی ہوگا۔''

''کیوں؟'' اختر خفا ہو گیا۔ ''وہ کوئی سکھ ہے!''

پرمشیر سنگھ خاموش ہو گیا۔

چاند بہت بلند ہو گیا۔ رات خاموش تھی۔ کبھی کبھی گنے کے کھیتوں کے آس پاس گیدڑ روتے اور پھر سناٹا چھا جاتا۔ اختر پہلے تو گیدڑوں کی آواز سے ڈرا مگر پرمشیر سنگھ کے سمجھانے سے بہل گیا۔ اور ایک خاموشی کے طویل وقفے کے بعد اس نے پرمشیر سنگھ سے پوچھا۔ اب کیوں نہیں روتے گیدڑ؟'' پرمیشر سنگھ ہنس دیا۔ پھر اسے ایک کہانی یاد آ گئی۔ یہ گورو گوبند کی کہانی تھی۔ لیکن اس نے بڑے سلیقے سے سکھوں کے ناموں کو مسلمانوں کے ناموں میں بدل دیا اور اختر۔ پھر؟ پھر؟ کی رٹ لگاتا رہا۔ اور کہانی ابھی جاری تھی جب اختر ایک دم بولا۔ ''ارے چاند تو سر پر آ گیا!''

پرمشیر سنگھ نے بھی رک کر اوپر دیکھا۔ پھر وہ قریب کے ٹیلے پر چڑھ کر دور دیکھنے لگا۔ اور بولا۔ ''تمہاری اماں کا دیس جانے کدھر چلا گیا۔''

وہ کچھ دیر ٹیلے پر کھڑا رہا جب اچانک کہیں بہت دور سے اذان کی آواز آنے لگی اور اختر مارے خوشی کے یوں کودا کہ پرمشیر سنگھ اسے بڑی مشکل سے سنبھال سکا۔ اسے کندھے پر سے اتار کر وہ زمین پر بیٹھ گیا اور کھڑے ہوئے اختر کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''جاؤ بیٹے۔ تمہیں تمہاری اماں نے پکارا ہے۔ پس تم اس آواز کی سیدھ میں۔۔۔۔۔''

''شیش!'' اختر نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔ اور سرگوشی میں بولا۔ ''اذان کے وقت نہیں بولتے۔''

''پر میں تو سکھ ہوں بیٹے۔'' پرمشیر سنگھ بولا۔

''شیش!'' اب کے اختر نے بگڑ کر اسے گھورا۔

اور پرمشیر سنگھ نے اسے گود میں بٹھا لیا۔ اس کے ماتھے پر ایک بہت طویل پیار دیا۔ اور اذان ختم ہونے کے بعد آستینوں سے آنکھوں کو رگڑ رگڑ کر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ میں یہاں سے آگے نہیں آؤں گا۔ بس تم۔۔۔۔''

''کیوں؟'' کیوں نہیں آؤ گے؟'' اختر نے پوچھا۔

''تمہاری اماں نے چھٹی میں یہی لکھا تھا کہ اختر اکیلا آئے۔'' پرمشیر سنگھ نے اختر کو پھسلا لیا۔''بس تم سیدھے چلے جاؤ۔سامنے ایک گاؤں آئے گا۔وہاں جا کر اپنا نام بتانا کرتارا نہیں۔اختر پھر اپنی ماں کا نام بتانا۔اپنے گاؤں کا نام بتانا اور دیکھو مجھے ایک چھٹی ضرور لکھنا۔

''لکھوں گا۔'' اختر نے وعدہ کیا۔

''اور ہاں تمہیں کرتارا نام کا کوئی لڑکا ملے تو اسے ادھر بھیج دینا۔اچھا؟''

''اچھا۔''

پرمشیر سنگھ نے ایک بار پھر اختر کا ماتھا چوما اور جیسے کچھ نگل کر بولا۔''جاؤ''

''اختر چند قدم چلا مگر پلٹ آیا۔''تم بھی آ جاؤ نا۔''

''نہیں بھئی۔'' پرمشیر سنگھ نے اسے سمجھایا۔''تمہاری اماں نے چھٹی میں یہ نہیں لکھا۔''

''مجھے ڈر لگتا ہے۔'' اختر بولا۔

''قرآن کیوں نہیں پڑھتے؟'' پرمشیر سنگھ نے مشورہ دیا۔

''اچھا۔'' بات اختر کی سمجھ میں آ گئی۔قل ہو اللہ کا ورد کرتا ہوا جانے لگا۔

نرم نرم افق کے دائرے پر اندھیرے سے لڑ رہی تھی۔اور ننھا سا اختر دور دھندلی پگڈنڈی پر ایک لمبے تڑنگے سکھ جوان کی طرح تیز تیز جا رہا تھا۔پرمشیر سنگھ اس پر نظریں گاڑھے ٹیلے پر بیٹھا رہا۔اور جب نقطہ فضا میں ایک حصہ بن گیا تو وہ وہاں سے اتر آیا۔

اختر ابھی گاؤں کے قریب نہیں پہنچا تھا کہ دو سپاہی لپک کر آئے اور اسے روک کر بولے''کون ہو تم؟''

''اختر!'' وہ بولا جیسے ساری دنیا اس کا نام جانتی ہے۔

''اختر!'' دونوں سپاہی کبھی اختر کے چہرے کو دیکھتے تھے اور کبھی اس کی سکھوں کی سی پگڑی کو۔پھر ایک نے آگے بڑھ کر اس کی پگڑی جھٹکے سے اتار لی تو اختر کے کیس کھل کر ادھر ادھر بکھر گئے۔

اختر نے بھنا کر پگڑی چھین لی اور پھر سر کو ایک ہاتھ سے ٹٹولتے ہوئے وہ زمین پر لیٹ گیا اور زور زور سے روتے ہوئے بولا۔میرا کنگھا لاؤ۔تم نے میرا کنگھا لے لیا ہے۔دے دو ورنہ میں تمہیں مار دوں گا۔''

ایک دم دونوں سپاہی زمین پر دھب سے گرے اور رائفلوں کو کندھے سے لگا کر جیسے نشانہ باندھنے لگے۔''ہالٹ!'' ایک پکارا اور جیسے جواب کا انتظار کرنے لگا۔پھر بڑھتے ہوئے اجالے میں انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ایک نے فائر کر دیا۔اختر فائر کی آواز سے دہل کر رہ گیا۔اور سپاہیوں کو ایک طرف بھاگتا دیکھ کر وہ بھی روتا چلاتا ہوا ان کے پیچھے بھاگا۔

سپاہی جب ایک جگہ پہنچ کر رکے تو پرمشیر سنگھ اپنی ران پر کس کر پگڑی باندھ چکا تھا۔مگر خون اس کی پگڑی کی سینکڑوں پرتوں میں سے بھی پھوٹ آیا تھا۔اور وہ کہہ رہا تھا۔''مجھے کیوں مارا تم نے۔میں تو اختر کے کیس کاٹنا بھول گیا تھا۔میں تو اختر کو اس کا دھرم واپس دینے

آیا تھا یارو۔"

دور اختر بھاگا آرہا تھا۔اور اس کے کیس ہوا میں اڑ رہے تھے۔

FRIENDS KORNER
FRIENDSKORNER.COM

مخبر

لالہ تیج بھان انسپکٹر نے دفترِ آبکاری میں ملتان کے چنے ہوئے مخبروں سے میرا تعارف کرایا اور جب وہ زرد چہروں اور میلی آنکھوں کی اس قطار کے آخر میں پہنچے تو بولے۔ "یہ خادو ہے۔"

سب مخبر متعارف ہونے کے بعد باہر چلے گئے تھے اور اب ہمارے سامنے صرف خادو کھڑا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے خادو کو کسی نے شکنجے میں سے نچوڑ کر نکال لیا ہے۔ اور اب جیتے جاگتے انسان کے بجائے میرے سامنے انسان کا ایک مڑا تڑا چھلکا رکھا ہے۔ وہ سر سے ننگا تھا۔ لمبے لمبے پٹے گردن تک لٹک رہے تھے۔ مانگ میں اینٹھیں سی تھی۔ البتہ اس نے چوٹی پر مستطیل شکل کے ایک منڈے ہوئے حصے کی راہ سے سر کو خوب تیل پلا رکھا تھا۔ ایک کان پر سگریٹ کا ایک ٹکڑا اٹکا ہوا تھا۔ اور دوسرے کان کی لو میں ایک چھلا سا لٹک رہا تھا۔ "استاد کی نشانی ہے۔" اس نے بعد میں مجھے بتا دیا تھا۔۔۔ "استاد نے کہا تھا کہ تو پہلا آدمی ہے جو میری طرح بھنگ کا یہ گھڑا پی کر ایک منگرا اور مانگ رہا ہے۔ ورنہ یہاں تو بڑے بڑے نشئی دو تین منگروں کے بعد ہی راجہ سالو بن جاتے ہیں۔"

آنکھوں میں سرمہ لگا رکھا تھا مگر پتلیاں ایسی گدلی گدلی سی تھیں۔ جیسے برسوں کی دھول سمٹ رکھی ہو۔ ناک ہلدی کی گانٹھ معلوم ہوتی تھی اور ہونٹ اس کے چہرے سے کچھ زیادہ ہی سیاہ تھے۔ گردن کی ایک ایک رگ کچھ یوں غیر معمولی طور سے ابھری اور تنی ہوئی تھی جیسے اس کے دماغ اور دل میں رسہ کشی ہو رہی ہے۔ کرتے میں میل رچ گیا تھا اور تہبند جابجا شوربے کے دھبے تھے۔

لالہ تیج بھان نے جب اس کا نام بتایا تو وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور اس کے کالے حاشیوں والے لمبے لمبے دانت یوں ایک ساتھ نمایاں ہو گئے جیسے کسی نے کچا تربوز چیر ڈالا ہے۔ مگر مجھے اتنے بہت سے دانتوں کے آس پاس مسوڑے کا کوئی نشان نظر نہ آیا۔

"چرس نے کھا لئے۔" اس نے بعد میں بتایا تھا۔ "اور مسوڑوں کا کیا ہے سائیں۔ یہی ہوگا نہ کہ دانت گر جائیں گے۔ گر جائیں۔ چرس تو پوپلے منہ سے بھی پی جا سکتی ہے۔"

اس کے نیچے کے دو دانتوں پر چاندی کا ایک ایک تار لپٹا ہوا تھا۔ اور دانتوں کی ریخوں میں دنوں کا کوڑا گھسا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

لالہ جی بولے۔ "یہ خادو ہے۔ میں اسے خادو جادو کہتا ہوں۔ کیونکہ یہ سارے ملتان میں پہلا مخبر ہے۔ پہلا نمبر تو یہ دلاسہ سنگھ بھی ہے۔ پر بات یہ ہے کہ مجھے اس ضلع میں آئے ڈھائی برس ہو رہے ہیں۔ ڈھائی برس میں تیس مہینے ہوتے ہیں۔ خادو نے تیس مخبریاں کی ہیں اور تیس کی تیس سچی مخبریاں۔ اور تیسوں اتنے بڑے مقدمے کہ ڈی۔ سی نے چند مقدموں پر تو مجھے۔ ویل ٹون' دیا اور ایک مقدمے پر پانچ سو روپے انعام کی سفارش کر دی۔ خادو نے بھی ان مخبریوں میں کوئی ہزار روپیہ تو کمایا ہوگا۔"

خادو پہلی بار بولا۔ "اللہ نگہبان ہو، جھوٹ کیوں بولوں۔ آپ کے دربار سے میں نے تو گیارہ سے چھلڑ پائے۔ بچے دعائیں دیتے ہیں۔"

لالہ تیج بھان بولے۔ "اب یہ خادو کا جادو نہیں تو اور کیا ہے۔ کہ اس کی کوئی بھی مخبری غلط نہ نکلی۔ ایک آدھ بار کوئی نہ کوئی گڑ بڑ ہو ہی جاتی ہے۔ اسی دلاسہ سنگھ کو لیجئے۔ شراب کی بھٹیوں کا مخبر ہے۔ آٹھ بھٹیاں پکڑوا چکا ہے۔ مگر جب نویں کی باری آئی تو کیوں دلا سے یاد

ہے؟ ہم کھیتوں میں پہنچے تو جہاں اس نے بھٹی کی نشان رہی کی تھی وہاں راکھ اڑ رہی تھی۔ ہم نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا تو دلا سے کی مخبری کے مطابق بھٹی چلانے والا کاہن سنگھ کھیت کی مینڈھ پر کھڑا تھا۔ بولا۔ٹھہر و دروغے۔ کھٹیا اٹھالاؤں۔ بیٹھو۔ گنے چوسو۔اور جب میں نے پولیس کے سامنے اپنی جھینپ مٹانے کے لئے ڈپٹ کر کہا یہاں خاک کی جگہ راکھ کیوں اڑ رہی ہے تو بولا۔ ''وہ تو کوئی ایسی حاص بات نہیں دروغے۔ جہاں دو تین مہینے شراب کی بھٹیاں چلتی رہی ہوں وہاں خاک کی جگہ راکھ ہی اڑے گی۔'' بات کا ڈھب بتا رہا تھا کہ ہمیں مخبری ہونے کے بعد سے بھی مخبری ہوگئی تھی۔ سو بڑے بڑے مخبر پر بھی ایسا وقت آہی جاتا ہے۔ پر یہ خادو۔ تو یہ ایک بار آیا۔ بولا بیس سیر افیون کا کیس ہے۔ میں نے کہا۔ بھنگ پی کے تو نہیں آئے۔ بولا قسم ہے محکمہ آبکاری کی۔ پوری بیس سیر افیون ہے۔ اب آپ سوچئے کہ بیس سیر افیون میں سولہ سو تولے افیون ہوتی ہے۔ اور ہم نے ایک ایک چھٹانک افیون کے مقدموں میں آدھے آدھے صفحے کی شاباشاں لی ہیں۔ میں یونہی دل لگی کیلئے اس کے ساتھ چل پڑا اسٹیشن پر پہنچا۔ گاڑی آئی۔ سیکنڈ کے ایک ڈبے میں ایک سوٹڈ بوٹڈ مسافر بیٹھا تھا۔ خادو نہیں کہا یہی ہے۔ سپاہیوں نے مسافر کو گھیر لیا۔ سامان کی تلاشی ہوئی تو چار بکسوں کے خفیہ پیندوں میں پانچ پانچ سے افیون پڑی مہک رہی ہے۔ ضلع میں دھوم مچ گئی۔ اخباروں میں خبریں چھپیں اور آبکاری کی نوکری کا مزا آ گیا۔ اسی مقدمے پر میرے لئے پانچ سو روپے کے انعام کی سفارش ہوئی تھی۔ سو اس خادو کو بالکل سچا موتی سمجھئے۔ ایسے ایماندار مخبر ذرا کم ہی ملتے ہیں۔ کیوں خادو۔ اس اللہ بخش چنڈو لے کا کیا بنا۔''

خادو بولا۔ ''اللہ نگہبان ہو۔ وہ تو سائیں ابھی میں یاری ہی لگا رہا ہوں۔ چار بار سال سال کی قید بھگتی ہے تو اب بڑا کایاں ہو گیا ہے۔ جانے چنڈو کی شیشی کہاں رہتی ہے۔ حرامزادہ ہوا ہی نہیں دیتا۔ ایک بار اسے میرے ہاتھ میں شیشی دینے کا اعتبار آ جائے۔ پھر دیکھئے کیسے شکرے کی طرح جھپٹتا ہوں۔ کل کہہ رہا تھا۔ مجھے ان آس پاس کی قبروں والوں کی قسم۔ تو مجھے بڑا گھنا لگتا ہے۔ میں نے کہا۔ چنڈو پیتا ہوں تو کیا گھنا بھی نہ لگوں گا۔ ہنس دیا پر بڈھے کا ایمان مجھ پر جم نہیں رہا۔ میں بھی سوچتا ہوں۔ کہ آخر کب تک۔ صبر کا پھل تو آخر خدا دیتا ہی ہے۔ اللہ نگہبان ہو۔''

''اور یہ دلاسہ سنگھ۔'' لالہ تیج بھان نے ادھیڑ عمر کے سکھ کی طرف اشارہ کیا۔ دلاسہ سکھ نے میری طرف دیکھا ہی نہیں۔ وہ انسپکٹر کی طرف ہی دیکھتا رہا۔ اور اچانک تڑپ کر خادو سے بولا۔ ''ابے اوپر کیوں چڑھ آ رہا ہے۔ ہٹ کر کھڑا ہو۔ لالہ جی کو بات کرنے دے۔''

مگر لالہ جی نے سوائے اس کے کوئی بات نہ کی کہ ''اس کی تعریف تو میں کر ہی چکا ہوں۔ میرا خاص الخاص آدمی ہے۔''

دلاسہ سنگھ کے تیور بتا رہے تھے کہ اسے ٹرخا دیا گیا ہے۔ اس نے نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دبا کر داڑھی میں دو انگلیاں ڈالیں اور ٹھوڑی کو چھر رچھر رملا۔ پھر مجھے سلام کئے بغیر وہ لالہ تیج بھان کے پیچھے پیچھے ان کے کمرے کی طرف جانے لگا۔

مجھے چند روز دفتر کی فضا اور بڑے بڑے رجسٹروں اور منشیات کے ٹھیکہ داروں سے مانوس ہونے میں لگے اور اپنے حلقے کے دور دراز کے بعض قصبات میں بھنگ اور افیون کے ٹھیکوں کا معائنہ میں بھی کر آیا۔ ایک روز میں ایک ٹھیکدار کے ہمراہ ایک تانگے میں دفتر جا رہا تھا کہ میں نے کوچوان سے کہا۔ ''بھئی خدا کے لئے تانگا احتیاط سے چلانا۔ تم تو سگریٹ میں چرس پی رہے ہو۔'' کوچوان نے پلٹ کر میری

طرف دیکھا۔ مسکرایا اور بولا۔ پی تو رہا ہوں بابو، پر آج ہی تو نہیں پی رہا۔ برسوں سے چرس بھی چل رہی ہے اور تانگا بھی چل رہا ہے۔''

ٹھیکہ دار نے پاگلوں کی طرح میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اور پھر کچھ اس قسم کی بے ہنگم آوازیں نکالیں جیسے مجھے کسی شعر پر داد دے رہا ہے۔ ''آہاہاہا۔ واہ۔ مزا آ گیا۔'' وہ بولا۔ ''تیس برس ہو گئے آبکاری والوں سے نمٹتے ہوئے پر بھگوان کی قسم۔ ایسا داروغہ آج ہی دیکھا کہ نوکری شروع ہوئے مہینہ بھی نہیں گزرا اور چرس کی بو پہچان لی۔ حد ہو گئی۔''

ٹھیکہ دار کی دادو تحسین نے کچھ ایسا پھلا دیا کہ میں تانگے ہی میں بیٹھے بیٹھے انسپکٹر بن گیا۔ مگر جب دفتر آ کر چوتھے ہفتے کی ڈائری انسپکٹر کی خدمت میں پیش کی تو وہ بولے۔ ''یہ آپ سیر و سیاحت ہی کرتے رہیں گے یا کبھی کوئی مقدمہ بھی پکڑیں گے؟''

''مخبری ہوگی تو پکڑ لوں گا۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔

''اور گر مخبری نہ ہوئی تو؟'' لالہ تیج بھان نے پوچھا۔

''تو مجبوری ہے۔'' میں نے اپنی طرف سے منطقی لحاظ سے معقول جواب دیا مگر لالہ تیج بھان کو غصہ آ گیا۔ ''تو صاحب اس طرح تو گورنمنٹ بھی آپ کو نوکری سے جواب دینے پر مجبور ہو جائے گی۔''

''یعنی مخبری نہ بھی ہو۔ جب بھی کہیں سے کسی کو پکڑ لاؤں؟''

''جی ہاں۔'' لالہ بولے۔

''کمال ہے۔'' میں نے بے بسی سے اپنے تعجب کا اظہار کیا۔

''کمال ہے۔'' مجھے دوسرے روز پھر اسی تعجب کا اظہار کرنا پڑا کیونکہ ڈپٹی کمشنر نے بھی میری ڈائری پر دستخط کرتے ہوئے میری سستی اور کاہلی کے سلسلے میں ''وارننگ'' دے ڈالی تھی۔

لالہ تیج بھان نے نرمی سے کہا۔ ''یہ کوئی خاص بات نہیں۔ شروع شروع میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ مدتوں سے خادو میرے پاس نہیں آیا۔ جانے بیمار ہو گیا یا کہیں باہر چلا گیا۔ وہ آ جائے تو میں اسے آپ کے حوالے کر دوں گا کہ کوئی بھنگ ونگ ہی کا کیس پکڑوا دے۔ میرے لئے تو صرف دلاسہ سنگھ کافی ہے۔ اپنے چپڑاسی کو شہر میں بھیجئے کہیں سے خادو کو ڈھونڈ لائے۔ کسی تکئیے میں پڑا ہو گا۔ مرا نہیں۔ چرسی لوگ آسانی سے نہیں مرتے۔''

میں نے چپڑاسی کو حکم دیا کہ خادو کو ڈھونڈ لاؤ۔ اور جب میں شام کو گھر پہنچا تو خادو میرے ملازم کے پاس بیٹھا اپنی آنکھوں میں گھسی ہوئی مکھیاں اڑا رہا تھا اور اس کی سر کی منڈی ہوئی مستطیل پر گرد جمی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی فرشی سلام کیا اور پھر رونے لگا۔

میں اسے باہر برآمدے میں لے آیا اور ایک کھاٹ پر بٹھا کر پوچھا۔ ''بیمار ہو گیا؟''

''آپ تو سائیں بھولے بادشاہوں کی سی باتیں کرتے ہیں۔'' وہ بولا۔ ''بیماری کو مجھ سے کیا لینا ہے۔ میں تو ایک عجیب مصیبت میں پھنس گیا ہوں سائیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھ بیمار بے چارے سے کون سا گناہ ہو گیا۔ جس تکیے پر جاؤں۔ دھکے دے کر نکال دیا جاتا ہے۔ اللہ بشک چنڈو والے پر آدھے مہینے سے ہاتھ پھیر رہا تھا پر اس کے پاس پرسوں گیا تو وہ بولا۔ ''جا جا حرامزادہ مخبر کہیں کا۔ چنڈو پینے

آ تا ہے۔صورت تو دیکھو چنڈو پینے والے کی چنڈو تو بادشاہوں کا نشہ ہے۔اور پھرے کہتا تھا نا کہ تو مجھے گھنا لگتا ہے۔تیری آنکھوں میں حرص ہے۔آج کے بعد میرے تکیے میں آیا تو قبر میں زندہ گڑوا دوں گا۔قبروں میں تو رہتا ہی ہوں''سوسائیں اللہ نگہبان ہو۔یہ کہتا تھا وہ۔میں تو بالکل اشتہار بن گیا ہوں۔

جو دیکھتا ہے۔پڑھ لیتا ہے۔بھنگ کا مقدمہ میں نے آج تک نہیں پکڑوایا۔اس لئے بے چارے بوٹی بے چنے والے پیسے دو پیسے ہی کا تو سودا کرتے ہیں۔پر میں نے تنگ آ کر کہا۔لاؤ اللہ یار بھنگ والے کو ٹٹولوں۔میں وہاں گیا۔کونڈی میں گھنگھروں بھر موسل چھما چھم چل رہا تھا۔میں نے کہا وقت پر پہنچے۔اکنی کا مونگرا دے ڈالے تو فوراً آپ کے پاس پہنچوں اور بسم اللہ تو کراؤں۔وہ مجھے دیکھ کر بولا''آؤ بھی خادو کیسے ہو۔تم تو بڑے بڑے نشوں کی دنیا میں رہتے ہو۔ہمارے یہاں تو تمہارا مدتوں بعد آنا ہوتا ہے۔لاؤ تمہاری ذرا سی خاطر کردوں۔''اور سائیں پتہ ہے اس نے میری خاطر کیسے کی؟''اٹھا۔اپنی ہی صورت کے دو کتے کھولے اور مجھ پر ہشکار دیئے۔یہ پنڈلی کا زخم دیکھا ہے آپ نے؟''

اس کی پنڈلی ٹخنے سے لے کر گھٹنے تک بانس کی طرح برابر چلی گئی تھی۔اور ایک جگہ کتے کے کاٹے کا زخم تھا۔جس پر کھرنڈ آ رہا تھا۔

وہ پھر رونے لگا اور رونی آواز ہی میں بولا۔''سچ کہتا ہوں سائیں۔میرا کوئی دشمن پیدا ہو گیا ہے۔ورنہ میں تو ہمیشہ جس تکیے میں گیا۔دنوں میں اعتبار جما لیا۔ایسا بھی ہوا کہ ایک تکیئے پر استاد کو پکڑایا اور دوسرے دن اسی تکیئے پر استاد کے خلیفے سے چرس خریدنے چلے گئے اور کسی نے شبہ بھی نہ کیا کہ اسی نے کل استاد کی بکری بٹھائی تھی۔میں تو مارے شرم کے آپ کے پاس نہیں آیا۔میں نے کہا ادھر لالہ جی مجھے اتنا بڑا مخبر بتا رہے تھے ادھر ایک کیس دے کر آپ کی پہلی ڈائری ٹھاٹھ سے بھرواتا۔پر سائیں۔اللہ نگہبان ہو۔میری روزی پر کوئی ضرورلات مار رہا ہے۔پتہ چلے تو۔۔۔''اور وہ ایک لمبی دائرے دار گالی بک کر آنسو پونچھنے لگا۔

خادو کے آنسوؤں کا جادو مجھ پر نہ چل سکا۔کیونکہ میرے لطیف احساسات پر تو ڈپٹی کمشنر کی''وارننگ۔''سوار ہو گئی تھی۔میں نے اسے تسلی دے کر چلتا کیا اور سیدھا انسپکٹر کے ہاں جا نکلا۔وہ اس وقت انگریزی شراب کے ٹھیکہ دار کی بیٹی کی شادی میں شمولیت کیلئے تیار ہو رہے تھے۔مجھے یوں بے وقت اپنے ہاں دیکھا تو ایک کونے میں لے جا کر بولے۔

''کوئی کیس ملا ہے؟''

''کیس کہاں ملا لالہ جی۔میں نے کہا۔خادو ملا ہے؟''

''خادو ملا ہے تو سمجھئے کیس مل گیا۔''وہ اپنی نکٹائی جھریاں درست کرتے ہوئے مسکرائے۔

میں نے انہیں خادو کی بے بسی کی تفصیل بتائی تو وہ کچھ دیر تک ایک بوٹ کی ٹو کو کدال کی طرح زمین پر مارتے رہے۔پھر بولے۔''بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔''پھر دوسرے بوٹ کی ٹو سے تھوڑی سی مٹی کھودی اور بولے۔''فکر نہ کیجئے۔میں کوئی انتظام کردوں گا۔کیس نہ ملے تو کیس پیدا کرنا چاہیئے۔''پھر مجھے حواس باختہ دیکھ کر بولے۔''یہاں یونہی چلتا ہے صاحب۔بڑے افسر یہی دیکھتے ہیں کہ کیس نہیں ملا۔یہ نہیں دیکھتے کہ کیوں نہیں ملا۔''

میں کھویا کھویا سا گھر واپس آ گیا۔ ایک دو روز خادو کے انتظار میں گزرے تیسرے روز دفتر جانے کو تیار بیٹھا تھا کہ دستک ہوئی۔ دروازہ کھلا تو سامنے دلاسہ سنگھ کھڑا تھا۔ بولا چلئے ایک کیس پیش کر دوں۔"

میں نے کہا۔ "بھئی دلاسہ سنگھ تم تو لالہ جی کے کوٹے میں شامل ہو۔ میرے حصے میں تو خادو آیا ہے۔"

بولا۔ "لالہ جی کی اجازت سے آیا ہوں۔ سنا ہے خادو پر تکیوں والے کتے چھوڑ رہے ہیں۔ مخبر کا پردہ ایک بار اٹھا تو مرتے دم تک کے لئے ننگا ہو گیا۔ ہمارا کاروبار شراب کی بھٹیوں کا ہے۔ اس لئے ہمارا سلسلہ باہر چکوں سے ہے اور پردے شہروں میں اٹھتے ہیں۔ کل ایک بھٹی پر ریڈ ہو رہا ہے۔ لالہ جی نے کہا جاتے جاتے آپ کی ڈائری بھروا دوں۔ چنڈو کا کیس ہے میں ان گندے نشوں کی دینا میں اب تک نہیں آیا تھا۔ پر آپ بھی ہمارے افسر ہیں۔ اور سنا ہے صاحب ضلع نے آپ کو ڈانٹا ہے۔ سو اس نے صرف آپ کو نہیں ڈانٹا۔ دلاسے کو بھی ڈانٹ دیا ہے۔ اور دلاسہ زہر پی لے گا پر ڈانٹ نہیں پیئے گا۔ اس وقت اینٹوں پر سر رکھے سب غٹ پڑے ہیں۔ راستے میں چار سپاہی لیجئے۔ میں چنڈو خرید کر اشارہ کر دوں گا۔ پھر آپ جانیں اور آپ کا کام۔"

چھاپہ کامیاب رہا۔ پانچ ملزموں کا چالان ہوا اور میری ڈائری پر ڈپٹی کمشنر نے مجھے "گڈ" دیا۔

اس کے بعد ایک ہی مہینے کے اندر میں نے بھنگ کے چار، افیون کا ایک اور چرس کے دو کیس پکڑے اور ان سب کا مخبر دلاسہ تھا۔ ایک کیس میں چرس ذرا سی کم تھی۔ دلاسے نے کہا۔ آپ استغاثہ تو لکھئے۔ استغاثے کے آخر میں جب میں چرس کا وزن پوچھا تو دلاسہ بولا۔ تول لیجئے چرس تولی گئی تو سابقہ وزن سے ایک تولہ زائد نکلی۔ میں نے حیران ہو کر دلاسے کی طرف دیکھا تو اس نے مجھے آنکھ مار دی اور میں نے استغاثے کے ملزموں سمیت پولیس کے حوالے کر دیا۔

اس دوران میں نے ایک بار خادو سے سرراہ ملاقات ہوئی۔ کان پر سگریٹ کا ایک ٹکڑا رکھے وہ ایک دیوار کا سہارا لئے کھڑا تھا۔ میں مزاج پوچھے تو بولا۔ "دمہ ہو گیا سائیں۔ سانس پیٹ میں سما نہیں رہی ہوا کا اتنا بڑا گولہ یہاں چھاتی میں گھس گیا ہے۔ اللہ نگہبان ہو۔" پھر وہ رونے لگا۔

مجھے دھڑا دھڑ کیس مل رہے تھے۔ اس لئے اس کے آنسو اس کے گالوں کے گڑھوں ہی میں بہہ گئے۔ میرے دل پر نہ ٹپک سکے۔ میں نے کہا۔ "روتے کیوں ہو؟ محنت کرو۔ سارا ملتان پڑا ہے۔ تم تو صرف چار پانچ تکیوں نے نکالے گئے ہو اور یہاں ملتان میں تو ہر دسویں مکان کے بعد ایک تکیہ ہے۔"

اچانک اس کے تیور بدل گئے۔ اس کی پتلیوں کے گدلے پن میں ڈراؤنی سی چمک پیدا ہوئی اور اس کے سیاہ حاشیوں والے، تربوز کے بیجوں کے سے دانت ایک ساتھ نمایاں ہو گئے۔ وہ بولا۔ "جانتا ہوں سائیں جانتا ہوں۔ دلاسے نے آپ کو اکٹھے آٹھ مقدمے دیئے ہیں۔ یہ سب میرے مقدمے تھے۔ پر وہ حرامزادہ مجھے لوٹ لے گیا۔ اور اسی نے میری مخبری کا ڈھنڈورا پیٹا ہے۔ اب میں مقدمے تو کیا پکڑوں گا۔ ہاں یہ دمہ دور ہو تو ایک چھرا دلاسے کے پیٹ میں اتارنے کا بڑا ہی شوق ہے۔" اور وہ مجھے سلام کئے بغیر سیٹیوں بھری کھانسی کے دھکے کھاتا ہوا مخالف سمت کو رینگ گیا۔"

چند روز بعد میں دفتر سے گھر آیا تو وہ میرے ملازم کے پاس بیٹھا ایک ہاتھ سے آنکھوں میں گھستی ہوئی مکھیاں اڑا رہا تھا۔ اور دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں گڑے ہوئے سگریٹ کی راکھ جھاڑنے کے لئے مسلسل چٹکیاں بجا رہا تھا۔ مجھے دیکھا تو پہلے خوب رویا اور پھر بولا، ''تین دن سے بھوکا بھی ہوں سائیں اور نشہ بھی ٹوٹا ہے۔ نشہ تو خیر آپ کیا پورا کرائیں گے۔ چپہ بھر روٹی مل جائے تو دلاسے کا پیٹ چاک کرنے کے لئے کچھ روز اور زندہ رہ جاؤں۔ اللہ نگہبان ہو۔''

میں نے ملازم کو الگ لے جا کر کہا کہ وہ خادو کو کھانا کھلا دے اور پھر اسے چلتا کر دے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ مگر دوسرے تیسرے دن وہ پھر موجود تھا۔ رونے سے پہلے بے حیاؤں کی طرح مسکرایا۔ میں نے دیکھا کہ اس نے نیچے کے دو دانت غائب ہیں۔ پھر ایک دم مجھے محسوس ہوا کہ وہ چھلا بھی اس کے کان کی لو میں موجود نہیں جو استاد نے ضرورت سے زیادہ بھنگ پینے کی خوشی میں اسے دے ڈالا تھا۔ میں نے وجہ پوچھی تو رونے لگا۔ بولا۔ نشہ ٹوٹ رہا تھا اور آپ جانیں نشئی گردن تڑوا لے گا پر نشہ نہیں ٹوٹنے دے گا۔ میں نے دانتوں اور کانوں کے تار بیچ کر سگریٹ بھر چرس لے لی۔ آدھی یہ میرے کان پر رکھی ہے۔ میں نے سوچا اکھڑے ہوئے دانتوں کو کوئی کب تک تار میں جکڑے پھرے۔ کبھی کسی نے مرے ہوئے گھوڑوں کو بھی اصطبل میں باندھا ہے۔ رہا استاد کا دیا ہوا چھلا سو اب کا ہے کو ملکوں بھنگ پینے کا اشتہار لئے پھروں۔ جب بوٹی کا ایک منگرا بھی نصیب نہیں ہوتا۔ اللہ نگہبان ہو۔''

میں نے اس سے آنے کا سبب پوچھا تو آنکھیں پونچھ کر بولا۔ ''وہی چپہ بھر روٹی کے لئے آیا ہوں سائیں۔''

میں نے جل کر کہا۔ ''کیا میں نے یہاں لنگر کھول رکھا ہے۔ کہ چرسیوں لوفروں کو روزانہ کھانا ٹھنسا تا پھروں۔ تم مخبر ہو۔ مخبری کرنا چاہو تو کرو اور سرکار سے انعام لو ورنہ مجھے بخشو۔ میں آبکاری کے ان داروغوں میں سے نہیں ہوں۔ کہ اکنی کی بھنگ کے مقدمے کی خاطر مخبروں کو ہفتوں مہمانیاں کھلاتے رہیں، اگر کوئی کیس نہیں دے سکتے تو جاؤ کسی تکیے پر پڑے رہو۔ پھر میں نے وہیں سے ملازم کو حکم دیا کہ آئندہ خادو کو میری اجازت کے بغیر گھر میں نہ گھسنے دے۔

وہ اس تمام دوران پلکیں جھپکے بغیر میری طرف دیکھتا رہا اور جب میں ملازم کو ہدایات دے چکا تو وہ آہستہ سے بولا۔ ''اجازت ہے۔''

میں نے کہا۔ ''تو اور کس طرح اجازت دی جاتی ہے۔''

''اللہ نگہبان ہو۔'' وہ بولا اور چپکے سے باہر نکل گیا۔

دوسرے روز دلاسی سنگھ نے مجھے ناجائز شراب فروشی کا ''دو بوتلی۔'' کیس پکڑوا دیا۔ میں استغاثہ لکھ کر ملزم کو پولیس کے سپرد کر کے گھر آیا تو خادو باہر دروازے سے لگا بیٹھا تھا اور میرے ملازم نے اندر سے زنجیر چڑھا رکھی تھی۔

میں نے چھوٹتے ہی کہا۔ ''دیکھو خادو مجھ پر تمہارا جادو ذرا مشکل ہی چلے گا۔ میں دیکھ چکا ہوں تم کتنے پانی میں ہو۔ تم سے ایک بار کہہ چکا ہوں کہ میں چرسیوں لوفروں کے لئے ۔۔۔۔۔۔۔''

ایک کیس ہے۔'' وہ یوں بولا جیسے ٹین کی چادر پر کنکر گر پڑے ہیں۔

''کیس ہے؟'' گرمی سے نرمی کی طرف پلٹتے ہوئے میرے ذہن کو صرف یہی الفاظ سوجھے اور میرے سامنے آنے والے ہفتے کی ڈائری کے ورق کھل گئے۔

''جی۔'' وہ اسی طرح بیٹھے بیٹھے ٹن سے بولا۔

''کیا کیس ہے؟''

''چھوٹا سا کیس ہے۔ ایک آدمی بھنگ بیچ رہا ہے۔ پر کیس تو ہے سائیں۔''

''ہاں کیس تو ہے۔'' میں نے اس سے اتفاق کیا۔ ''کہاں ہے؟''

''کالے منڈی میں۔''

''کب چلیں؟''

''ابھی چلئے۔ نیا نیا آدمی ہے۔ وقت بے وقت کی پروا نہیں کرتا۔ جب جائیے۔ ٹکے میں منگرا خرید لیجئے۔ آپ نے انگریزی سوٹ پہن رکھا ہے۔ پر وہ آپ کو بھی دے دے گا۔ بڑا ہی بھولا آدمی ہے۔''

''تو پھر چلو۔''

''چلئے۔ اللہ نگہبان ہو۔'' وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر آہستہ آہستہ اٹھا اور پھر جیسے چکرا کر دیوار کا سہارا لے لیا۔ اس کی آنکھیں پتھرا گئیں اور گھٹنے کانپنے لگے پھر اس پر کھانسی کا ایک دورہ پڑا اور وہ کمان کی طرح دوہرا ہو کر دیر تک کھانستا رہا۔ حتیٰ کہ کھانسی اس کے حلق میں سیٹیاں اور چیخیں بن کر نکلنے لگی۔

میں نے دروازہ کھلوا کر اندر سے ایک مونڈھا اٹھوا لایا مگر اس نے دھونکنی کی طرح چلتی ہوئی سانسوں میں کہا۔ ''نہیں جی۔ اس کی ضرورت نہیں۔ اللہ نگہبان ہو۔''

پھر وہ سیدھا ہو گیا۔ آستین سے آنکھیں پونچھیں۔ کان پر سے سگریٹ کا ٹکڑا اٹھا کر مجھ سے دیا سلائی مانگی اور سگریٹ جلا کر بولا۔ ''چلئے۔''

تھانے تک اس نے مجھ سے کوئی بات نہ کی۔ صرف سگریٹ پیتا اور چرس کی بو پھیلاتا رہا۔ ہم تھانے کے پاس پہنچے تو وہ ایک بار پھر زور سے کھانسا اور اس کی ہر سانس کے ساتھ اس کے حلق سے کچھ ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے کچھ دور بہت سے آرہ کش ایک لکڑیاں چیر رہے ہیں۔ میرے چہرے پر تردد کے آثار دیکھ کر فوراً بولا۔

اس کھانسی اور اس کھانسی میں بڑا فرق ہے سائیں۔ وہ کھانسی دمے کی تھی۔ یہ کھانسی چرس کی ہے۔ اس سے سینہ پھٹتا تھا۔ اس سے نشہ پاؤں کی ناخنوں سے ماتھے کی ٹھیکری تک پھیلتا ہے۔ فکر کی بات نہیں۔ اللہ نگہبان ہو۔''

تھانے سے میں نے پولیس کے چند سپاہی لئے اور کالے منڈی کا رخ کیا، بہت سی نیم تاریک اور سیلی سیلی گلیوں میں سے گزرنے کے بعد وہ رکا۔ اس نے اپنے ہڈیوں بھرے ہاتھ سے میرا ہاتھ دبایا اور ادھر ادھر دیکھ کر بولا۔ ''وہ سامنے جو دروازہ کھلا ہے نا۔ اس میں آپ

داخل ہو جائیے۔ سپاہیوں کو باہر رہنے دیجئے۔ آپ خود جا کر ٹکے کا منگرا خرید لیجئے۔ کیس یوں آپ سے سامنے رکھا ہے جیسے آپ کے سامنے میں کھڑا ہوں۔ چلئے۔ بسم اللہ کیجئے۔ اللہ نگہبان ہو۔''

وہ پلٹ کر گلی کے موڑ کی طرف رینگ گیا۔ اور میں اس کے مشورے کے مطابق کھلے دروازے میں سے اندر داخل ہو گیا۔ خاصی معتبر صورت کا ایک آدمی پانچ آدمیوں کے درمیان بیٹھا نئے نئے موسل سے نئی نئی کونڈی میں بھنگ گھوٹ رہا تھا اور پانچوں آدمی مٹی کے نئے نئے مونگروں میں بھنگ پی رہے تھے۔ ایک طرف دو نئے نئے گھڑے رکھے تھے۔ جن کے دہانوں پر سرخ ململ کی نئی نئی صافیاں بندھی تھیں۔ اور چھوٹے سے آنگن کے ایک کونے میں تین کالے کالے بچے کھجور کی گٹھلیوں سے کوئی کھیل کھیل رہے تھے۔

معتبر صورت آدمی میری طرف دیکھ کر ذرا سا چونکا اور موسل چلانا بند کر دیا جب میں نے مسکرا کر بوٹی کا ایک منگرا طلب کیا تو اس نے اپنے نیچے سے پیڑھی نکال کر میری طرف بڑھا دی۔ اور مجھے بیٹھنے کو کہا۔ ''بسم اللہ'' وہ بولا۔ ''خشخش والی کہ سادہ؟''

''سادہ۔'' میں نے کہا تا کہ دیر نہ لگے اور گلی میں کوئی آتا جاتا پولیس کے سپاہیوں کو نہ دیکھ لے۔

ایک منگرا اٹھا کر اس نے ایک گھڑے کو جھکایا جس میں دڑ دڑ کی آوازیں پیدا ہوئیں۔ گھڑا بھنگ سے لبریز رکھا تھا۔ ایک اکنی جس پر میں نے پہلے سے چاقو کی نوک سے دستخط کر رکھے تھے۔ اس کی طرف پھینک کر میں نے منگرا ہاتھ میں لے لیا۔ اور مجوزہ منصوبے کے مطابق کھانس دیا۔ سپاہی لپک کر آئے اور ملزم چہرے سے لے کر ہاتھوں کے ناخنوں تک پر ہلدی کھنڈ گئی۔ میں نے بھرے ہوئے دونوں گھڑوں کو سر بمہر کر کے استغاثہ لکھا اور ملزم میراں بخش کو پولیس کے حوالے کر دیا۔ تینوں بچے چیخ چیخ کر روتے ہوئے میراں بخش کی ٹانگوں سے چمٹ گئے۔ ایک عورت کوٹھے سے نکل کر بین کرنے لگی۔ آس پاس کی چھتوں پر بکھرے ہوئے بالوں اور میلے چہروں والی عورتوں کے ٹھٹ لگ گئے اور میراں بخش ہکا بکا کھڑا سامنے کھلے دروازے سے پار دیکھتا رہ گیا۔

دوسرے روز دفتر گیا تو خادو پہلے سے دروازے میں موجود تھا، میں اندر کرسی پر جا کر بیٹھا تو وہ بھی اندر آ گیا اور میرے قریب ہی فرش پر بیٹھ کر بولا۔ ''کیس کیسا تھا۔ سائیں؟''

''بہت اچھا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''پورے دو گھڑے لبالب بھرے رکھے تھے۔''

''پورے دو گھڑے؟'' وہ ضرورت سے زیادہ حیران نظر آنے لگا۔

ذرا وقفے کے بعد وہ بولا۔ ''ایک بات کہوں سائیں۔''

''کہو۔'' میں نے کہا۔

''اللہ نگہبان ہو۔'' وہ بولا۔ ''میراں بشک کے ساتھ ذرا سی رعایت ہو سکے گی؟''

''رعایت'' میں نے پوچھا۔ ''رعایت کیسی؟''

''بات یہ ہے سائیں۔'' خادو میری کرسی کے ساتھ لگ کر میری پنڈلی دبانے لگا۔

''میراں بشک سے کام میں نے ہی شروع کرایا ہے۔ بے چارا بالکل بھوکا ہے۔ پہلے کھجوروں کی چھابڑی لگاتا تھا۔ نیا نیا ہے۔ قید

نہ ہو۔ جرمانہ ہو جائے بس اتنی سی رعایت چاہیئے۔''

میں نے سب انسپکٹر آبکاری کی حیثیت سے کہا۔ ''وہ ملزم ہے اور ملزم سے کوئی رعایت نہیں کی جا سکتی۔''

''پر سنئے تو سائیں۔'' خادو نے ایک بچے کی طرح بلک بلک کر روتے ہوئے کہا۔ ''یہ میراں بشک میرا بڑا بھائی ہے نا۔ جرمانہ ہو جائے تو اس کو پکڑوانے کا مجھے جو انعام ملے گا۔ اسے میں جرمانے میں دے دوں گا۔ اللہ نگہبان ہو۔''

بابا نور

''کہاں چلے بابا نور؟'' ایک بچے نے پوچھا۔

''بس بھئی یہیں ذرا ڈاک خانے تک۔'' بابا نور بڑی ذمہ دارانہ سنجیدگی سے جواب دے کر آگے نکل گیا۔

اور سب بچے کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

صرف مولوی قدرت اللہ چپ چاپ کھڑا بابا نور کو دیکھتا رہا۔ پھر وہ بولا۔ ''ہنسو نہیں بچو۔ ایسی باتوں پر ہنسا نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات بڑی بے پرواہ ہے۔''

بچے خاموش ہو گئے اور جب مولوی قدرت اللہ چلا گیا تو ایک بار پھر سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

بابا نور نے مسجد کی محراب کے پاس رک کر جوتا اتارا ننگے پاؤں آگے بڑھ کر محراب پر دونوں ہاتھ رکھے اور اسے ہونٹوں سے چوما۔ پھر اسے باری باری دونوں آنکھوں سے لگایا۔ الٹے قدموں واپس ہو کر جوتے پہنے اور جانے لگا۔

بچے یوں ادھر ادھر کی گلیوں میں کھسکنے لگے جیسے ایک دوسرے سے شرما رہے ہیں۔

بابا نور کا سارا لباس دھلے ہوئے سفید کھدر کا تھا۔ سر پر کھدر کی ٹوپی تھی جو سر کے بالوں کی سفیدی کی وجہ سے گردن تک چڑھی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اس کی سفید داڑھی کے بال تازہ تازہ کنگھی کی وجہ سے خاص ترتیب سے اس کے سینے پر پھیلے ہوئے تھے۔ گورے رنگ میں زردی نمایاں تھی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کی پتلیاں اتنی سیاہ تھیں کہ بالکل مصنوعی معلوم ہوتی تھیں۔ لباس، بالوں اور جلد کی اتنی بہت سی سفیدی میں یہ دو کالے بھونرا نقطے بہت اجنبی لگتے تھے۔ لیکن یہی اجنبیت بابا نور کے چہرے پر بچپنے کی سی کیفیت طاری رکھتی تھی۔ بابا نور کے کندھے پر سفید کھدر کا ایک رومال تھا جو لوگوں کے ہجوم سے لے کر مسجد کی محراب تک تین چار بار کندھا بدل چکا تھا۔

''ڈاک خانے چلے بابا نور؟'' دکان کے دروازے پر کھڑے ہوئے ایک نوجوان نے پوچھا۔

''ہاں بیٹا۔'' جیتے رہو۔ بابا نور نے جواب دیا۔

پاس ہی ایک بچہ کھڑا تھا۔ تڑاک سے تالی بجا کر چلایا۔ ''آہاہا۔ بابا نور ڈاک خانے چلا ہے۔''

''بھاگ جا یہاں سے۔'' نوجوان نے گھر کا۔

اور بابا نور جو کچھ دور گیا تھا پلٹ کر بولا۔ ''ڈانٹتے کیوں ہو بچے کو۔ ٹھیک ہی تو کہتا ہے۔ ڈاک خانے ہی تو جا رہا ہوں۔''

دور دور سے ڈور ڈور کر آتے ہوئے بچے یہاں سے وہاں تک بے اختیار ہنسنے لگے اور بابا نور کے پیچھے ایک جلوس مرتب ہونے لگا مگر آس پاس سے کچھ نوجوان لپک کر آئے اور بچوں کو گلیوں میں بکھیر دیا۔

بابا نور اب گاؤں سے نکل کر کھیتوں میں پہنچ گیا۔ پگڈنڈی مینڈ مینڈ جاتی ہوئی اچانک ہرے بھرے کھیتوں میں اتر جاتی تھی تو بابا نور کی رفتار میں بہت کمی آ جاتی۔ وہ گندم کے نازک پودوں سے پاؤں، ہاتھ اور چولے کے دامن کو بچاتا ہوا چلتا۔ اگر کسی مسافر کی بے احتیاطی سے کوئی پودا پگڈنڈی کے آر پار لیٹا ہوا ملتا تو بابا نور اسے اٹھا کر دوسرے پودوں کے سینے سے لپٹا دیتا۔ اور جس جگہ سے پودے نے

خم کھایا تھا اسے یوں چھوتا جیسے زخم سہلا رہا ہے۔ پھر وہ کھیت کی مینڈ پر پہنچ کر تیز تیز چلنے لگتا۔

چار کسان پگڈنڈی پر بیٹھے حقے کے کش لگا رہے تھے۔ ایک کسان کی لڑکی گندم کے پودوں کے درمیان سے کچھ اس صفائی کے ساتھ درانتی سے گھاس کاٹتی پھر رہی تھی کہ مجال ہے جو گندم کے کسی پودے پر خراش آ جائے بابا نور ذرا سارک کر لڑکی کو دیکھنے لگا وہ گھاس کی دستی کاٹ کر ہاتھ کو پیچھے لے جاتی اور گھاس کے پیٹھ پر لٹکتی ہوئی گٹھڑی میں ڈال کر پھر درانتی چلانے لگتی۔

''بھئی کمال ہے۔'' بابا نور نے دور ہی سے کسانوں کو مخاطب کیا۔ ''یہ لڑکی تو بالکل مداری ہے۔ اتنی لمبی درانتی چلا رہی ہے۔ چپے چپے پر گندم کا پودا اگ رہا ہے۔ پر درانتی گھاس کاٹ لیتی ہے اور گندم کو چھوتی تک نہیں۔ یہ کس کی بیٹی ہے؟''

''تو کس کی بیٹی ہے بیٹا؟'' بابا نور نے لڑکی سے پوچھا۔

لڑکی نے پلٹ کر دیکھا تو ایک کسان کی آواز آئی۔ ''میری ہے بابا۔''

''تیری ہے؟'' بابا نور کسانوں کی طرف جانے لگا۔ ''بڑی سیانی ہے۔ بڑی اچھی کسان ہے۔ خدا حیاتی لمبی کرے۔''

''آج کہاں چلے بابا؟'' لڑکی کے باپ نے پوچھا۔

''ڈاک خانے؟'' دوسرے نے پوچھا۔

''ہاں!'' بابا نور ان کے پاس ذرا سارک کر بولا۔ ''میں نے کہا پوچھ آؤں شاید کوئی چھٹی وٹھی آئی ہو۔''

چاروں کسان خاموش ہو گئے۔ انہوں نے ایک طرف ہٹ کر پگڈنڈی چھوڑ دی اور بابا نور آگے بڑھ گیا۔ ابھی وہ کھیت کے پرلے سرے پر پہنچا تھا کہ لڑکی کی آواز آئی۔ ''لسی پیو گے بابا نور؟''

بابا نور نے مڑ کر دیکھا اور گاؤں سے نکلنے کے بعد پہلی بار مسکرایا۔ ''پی لوں گا بیٹا۔''

پھر ذرا سارک کر بولا۔ ''پر دیکھ ذرا جلدی سے لا دے۔ ڈاک کا منشی ہوا کے گھوڑے پر سوار رہتا ہے۔ چلا نہ جائے۔''

لڑکی نے گھاس کی لٹکتی ہوئی گٹھڑی کندھے سے اتار کر وہیں کھیت میں رکھی۔ پھر وہ دوڑ کر مینڈ پر اگی ہوئی بیری کے پاس آئی۔ تنے کی اوٹ میں پڑے ہوئے برتن کو خوب چھلکایا، ایلومونیم کا کٹورا بھرا اور لپک کر بابا نور کے پاس جا پہنچی۔

بابا نور نے ایک ہی سانس میں سارا کٹورا پی کر رومال سے ہونٹ صاف کئے بولا۔ ''تیرا نصیبہ اسی لسی کی طرح صاف ستھرا ہو بیٹا۔'' اور آگے بڑھ گیا۔

مدرسے کے برآمدے میں ڈاک کا منشی بہت سے لوگوں کے درمیان بیٹھا اپنے روزنامہ کے فارم بھی پر کر رہا تھا۔ اور دیہاتیوں کو معلومات سے بھی مستفید کر رہا تھا۔ ''میرا سالا وہاں کراچی میں چپراسی کا کام کرتا تھا۔ جب وہ مرا ہے تو مجھے فاتحہ کیلئے کراچی جانا پڑا۔ اتنی موٹریں کاریں ہیں کہ ہمارے گاؤں میں تو اتنی چڑیاں بھی نہیں ہوں گی۔ ایک ایک موٹر پر وہ وہ عورت ذات بیٹھی ہے۔ کہ اللہ دے اور اللہ ہی لے۔ بندہ نہ لینے میں ہے نہ دینے میں۔ بندوں کو پریوں سے کیا لینا دینا۔ اللہ کی قدرت یاد آ جاتی ہے۔ نماز پڑھنے کو جی چاہنے لگتا ہے۔ ایک سیٹھ کہہ رہا تھا کہ بس ایک اور بڑی لام لگ جائے تو کراچی ولایت بن جائے گا۔ کہتے ہیں لام میں لوگ مریں

گے۔ویسے بھوک سے مر جائیں گے۔ٹھیک ہے نا۔"

"ٹھیک ہی تو ہے۔" ایک دیہاتی بولا۔" پر منشی جی پہلے یہ بتاؤ کہ لفافہ اکنی کا کب کرو گے۔"

منشی نے اسے کچھ سمجھانے کیلیئے سامنے دیکھا تو اس کی نظر ایک نقطے پر جیسے جم کر رہ گئی۔اس کا رنگ فق ہو گیا اور وہ بجھی ہوئی آواز میں بولا۔" بابا نور آرہا ہے۔"

بچے مدرسے کے دروازوں اور کھڑکیوں میں جمع ہو کر۔" بابا نور۔بابا نور" کی سرگوشیاں کرنے لگے۔اور منشی نے انہیں ڈانٹ کر اپنی اپنی جگہ پر بٹھا دیا۔

سفید براق بابا نور سید ھا مدرسے کے برآمدے کی طرف آرہا تھا۔اور لوگ جیسے سہمے جارہے تھے۔

برآمدے میں پہنچ کر اس نے کہا۔" ڈاک آگئی منشی جی۔"

" آگئی بابا۔" منشی نے جواب دیا۔

" میرے بیٹے کی چٹھی تو نہیں آئی؟" بابا نور نے پوچھا۔

" نہیں بابا۔" منشی بولا۔

" بابا نور چپ چاپ واپس چلا گیا۔دور تک پگڈنڈی پر ایک سفید دھبا رینگتا ہوا نظر آتا رہا اور لوگ دم بخود بیٹھے اسے دیکھتے رہے۔

پھر منشی بولا۔" آج سے دس سال سے بابا نور اسی طرح آرہا ہے۔یہی سوال پوچھتا ہے اور یہی جواب لے کر چلا جاتا ہے۔بے چارے کو یاد ہی نہیں رہا کہ سرکار کی چٹھی بھی تو میں نے ہی اسے پڑھ کر سنائی تھی جس میں خبر آئی تھی کہ اس کا لڑکا برما میں بم کے گولے کا شکار ہو گیا۔

جب سے وہ پاگل سا ہو گیا ہے۔پر خدا کی قسم ہے دوستو کہ اگر آج کے بعد وہ پھر بھی پاس یہی پوچھنے آیا تو مجھے بھی پاگل کر جائے گا۔"

موچی

چمڑے کے دو ٹکڑے مونج کی موٹی رسی سے سلے ہوئے تھے۔نادر نے مونج کی سیون کو بھگو کر چھر رسے کاٹتے ہوئے کہا۔"تم کہتے ہو یہ چمڑا کسی بڈھے بھینسے کا ہے اور پہلے ہی قدم پر باجرے کی روٹی کی طرح ادھ بیچ سے دو ہو جائے گا۔ پر پیارے۔ چمڑے کو ذرا سا بھیگ کر سوکھنے دو۔ پھر دیکھنا یہ کیسے تمہاری گھر والی کی طرح چیاں چیاں بولتا ہے۔"

پیارے نے ہنستے ہوئے ایک پرانا جوتا اٹھایا اور نادر کے پیٹ پر دے مارا۔"الو کو ان دنوں گھر والیوں کے سوا کوئی بات ہی نہیں سوجھتی۔"

"شادی میں یہی کوئی دس دن باقی ہوں گے۔کیوں نادرے؟" بابا اللہ بخش نے پوچھا۔

"دس دن چھوڑ دس گھڑیاں باقی ہوں۔" نادر بولا۔"پر بابا تمہیں کیا۔ شادی تمہاری تو نہیں۔ میری ہے۔ تمہارے موچی کی۔"

"ہت تیرے موچی کی۔" بابا اللہ بخش نے مصنوعی رعب میں تھپڑ مارنے کے لئے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا اور پھر بے اختیار ہنسنے لگا۔

نادر نے پیارے کے پھینکے ہوئے جوتے کو اپنی گود سے ہٹایا تک نہیں بولا۔قصور کے جس سوداگر سے یہ چمڑا خریدا ہے وہ کہتا تھا کہ اس چمڑے کے تلے کو جوتا پہن کر گھر سے نکلو اور ولایت جا کر واپس آ جاؤ۔تم گھس جاؤ تو ہمارا ذمہ نہیں پر یہ تلا نہیں گھسے گا۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا۔" بابا اللہ بخش نے پیارے کو آنکھ مار کر کہا۔"کہ جسے بھینسے کا یہ چمڑا ہے وہ فولاد کا کشتہ کھاتا تھا۔"

پیارا ٹھاہ ٹھاہ ہنسنے لگا اور بابا اللہ بخش ذرا سا ہنس کر اور بہت سا کھانس کر اٹھا اور دروازے میں جا کر گلی میں تھوک دیا۔

نادر سکڑے ہوئے ہونٹوں میں پھوٹتی ہوئی مسکراہٹ سمیٹے مونج کی سیون کاٹتا رہا۔ایک ٹکڑے کو الگ کر کے اسے سامنے سے صاف ستھرے چوکور پتھر پر اس زور سے بجایا کہ بابا اللہ بخش "ہت تیری کی" کہہ کر رہ گیا اور باہر منڈیروں پر بیٹھی ہوئی چڑیوں پر جیسے بندوق چل گئی۔لحہ بھر کے لئے کچھ ایسا سناٹا چھا گیا جیسے چمڑا نہیں بجا تھا۔گولہ چھوٹا تھا۔

"بالکل گولا سا چھوٹا۔" بابا اللہ بخش نے ہتھیلیوں میں تمبا کو ملتے ہوئے کہا۔

"کیوں بھئی گولے بھی چھوٹیں گے؟ پیارے نے نادر سے پوچھا۔

اور نادر نے چمڑے کے ٹکڑے پر بھیگی دھجی پھیرتے ہوئے کہا۔"گولے نہیں چھوٹیں گے تو کیا بین ہوں گے! میری شادی ہو رہی ہے کوئی تمہارے باپ کا جنازہ تو نہیں اٹھ رہا۔"

پیارے نے دوسرا جوتا اٹھا کر نادر کے پیٹ پر دے مارا۔

بابا اللہ بخش اب کے سنجیدہ ہو گیا۔"جب سے آیا ہوں بکے جا رہے ہیں۔ جیسے جوانی سارے جگ میں بس انہی دو پر ٹوٹ پڑی ہے۔ہنسی مذاق میں کسی کے مرنے کی بات نہیں کرتے۔فرشتہ سن لیتا ہے۔"

"ہم دونوں یار ہیں بابا۔" پیارا بولا۔"ہمارا مذاق چلتا ہے۔"

''ضرور چھوٹیں گے گولے۔'' نادر جو زبان پر آئی ہوئی بات اب تک منہ میں سنبھالے بیٹھا تھا۔ بول اٹھا۔ ''جمعہ کہہ رہا تھا کہ اب کے لاہور سے بڑے بڑے نئے ڈیزاین کی آتش بازی سیکھ کر آیا ہے۔ کہتا ہے پہلے ایک چنگاری چمکتی ہے پھر ایک دم ایسا لگتا ہے جیسے آدھی رات کو سورج کودنے لگا۔ چنگاریوں کا چھاجوں مینہ برس پڑتا ہے۔ کہتا ہے آتش بازی بجھنے سے پہلے چنگاریاں آپس میں جڑ کر آگ گوں آگ پری بن جاتی ہیں اور جب یہ قہقہہ مار کر ہنستی ہے تو آتش بازی بجھ جاتی ہے۔''

''لاہور لاہور ہی ہے۔'' پیارے نے داد دی۔

اب تک کسی نے کونے میں دبکے ہوئے نوردادا کو نہیں دیکھا تھا۔ دراصل ذرا سا اونگھ گیا تھا۔ نسوار کی ڈبیا میں سے تین انگلیوں کی چٹکی بھر کر وہ نسوار کو پوپلے منہ کے دروازے کے کونوں کھدروں میں چھڑک آیا اور بولا۔ ''اے نادرے چپلی کا ودھر مرمت کر کے دینا ہے تو دے۔ جب سے آیا ہوں آتش بازیاں چھوڑ رہا ہے گدھا۔''

''دادا۔'' نادرے نے بڑی متانت سے پوچھا۔ ''یہ بتا ایمان ایمان سے کہ جب تیری شادی ہوئی تھی تو کیا تو نے اپنا جنازہ پڑھا تھا؟''

''جنازہ پڑھوں تیری ماں کا۔'' نوردادا کڑکا۔ ''ہم نے تو وہ لڈی ناچی تھی کہ ڈھولکئے نے ہاتھ جوڑ دیئے تھے اور کہا تھا بس مالکو۔ مجھے بخش دو۔ تم تو نہیں تھکے پر میرا ڈھول بجنے کی جگہ سے چھینکنے لگا ہے۔''

''دادا۔'' پیارے نے نتھنوں اور مونچھوں میں سے تمباکو کا گاڑھا دھواں نکال کر چلم کو نادر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''سنا ہے تیرے سر پر جو سونے کا سہرا بندھا تھا مانگے کا۔ تو اس کی دو پتریاں توڑ کر تو نے ٹیبک میں اڑس لی تھیں۔''

نادر اور پیارا اندھا دھند ہنسنے لگے اور جب ہنس چکے تو نوردادا نے بڑی متانت سے بڑے ہی نرم لہجے میں کہا۔ ''برخوردار تم دونوں نادرے سے لے کر پیارے تک، ایک سے لے کر سو تک۔ بڑے ہی ولایتی قسم کے حرامزادے ہو۔''

ایک بار پھر گولہ چھوٹنے کے بعد کی سی خاموشی چھا گئی کیونکہ نادر تو خیر موچی ہونے کی وجہ سے گالی پی گیا مگر پیارا موچی نہ تھا۔ اور نوردادا کی طرح گاؤں کے سب سے بڑے راجہ خاندان کا بھی فرد نہ تھا۔ مگر وہ بابا اللہ بخش کی طرح کسان تھا اور یہ گالی مفت میں نہیں کھا سکتا تھا۔ دے کر کھانے کی بات اور ہے۔

بابا نور بخش نے سہرے کی پتریوں کی چوری کے ذکر پر منہ پر ہاتھ رکھ لیا تھا اور صرف گنگنے پر اکتفا کی تھی اور لئے نوردادا کے ملے سے بچ گیا تھا مگر پیارے کے بگڑتے ہوئے تیور دیکھ کر اپنی بزرگی کے مدنظر اس نے صورت حال سنبھالنا اپنا فرض سمجھا۔ بولا۔ ''دیکھ دادا۔ تو راجہ ہے تو اپنے گھر میں راجہ ہے۔ راجہ شیر خاں اگر تیرا کوئی دور نزدیک کا بھانجا بھتیجا ہے تو ہوا کرے۔ پر اس موچی لڑکے سے سارے گاؤں کو بڑا پیار ہے اور تیرا بھی تو پرانا خدمت گار ہے۔ آٹھ دس دن میں اس لڑکے کی شادی ہے۔ اس عمر میں تو شادی کے خیال ہی سے ایسا ہو جاتا ہے۔ جیسے کوئی گدا گدائے جا رہا ہے۔ سو اگر لڑکے چہک رہے ہیں تو چہکنے دے۔ میں بھی تو تیری عمر کے لگ بھگ کا ہوں دادا۔ مجھ سے بھی تو یہ چہلیں کررہے ہیں۔ یہ ان کا حق ہے۔ یہ ہمارے بچے ہیں اور نادرا موچی ہے تو کیا ہوا؟ یہ بڑی چھوٹی سی بات ہے کہ جو تمہیں

جوتا گانٹھ کردے اس سے یہ بھی کہو کہ اب جوتا چاٹو بھی۔ یہ زمانہ بڑا بدل گیا ہے دادا۔ بڑے بڑوں کی عزتیں ٹکے سیر بک رہی ہیں۔ گالی نہ دیا کر۔"

نوردادا نے نسوار بھرا لعاب یہاں سے وہاں تک تھوک کر کہا۔"میں موچی کی دکان پر آیا ہوں۔ مسجد میں نہیں آیا۔"

بابا اللہ بخش نے جیسے بالکل بے بس ہو کر کہا۔"یہ تم راجوں کے دماغ خدا جانے ہمیشہ آسمان پر کیوں رہتے ہیں چاہے گھر میں پھوٹا کٹورا بھی نہ ہو۔"

"نوردادا۔"لڑائی کی بات کرنی ہے تو اپنے بیٹوں کو میرے بیٹوں کے پاس بھیج دے۔ دو دو ہاتھ ہو جائیں تو تیری بھی تسلی ہو جائے گی۔"

بات بڑھ گئی تھی اس لئے سنجیدگی بھی بڑھ رہی تھی۔ نادر نے بجلی کی سی تیزی سے نوردادا کی چپلی اٹھائی اور آن کی آن وہیں مرمت کر دیا۔

اور جب نوردادا چلا گیا تو نادر بولا۔"میں تو سمجھا کہ اگر اب وہیں نہیں گانٹھتا تو نوردادا مار ڈالے گا۔ اور شادی سے پہلے بس منگنی کر کے مرجانا تو ایسا ہی ہے جیسا پیاسا شربت بھرے کٹورے کو باہر سے چاٹ کر چلتا بنے۔"

"اس کی بات چھوڑ۔" بابا اللہ بخش بولا۔"جب سے راجہ شیر خان سے ڈپٹی کمشنر ملنے آیا ہے۔ سب راجوں کے دماغوں کو کچھ ہو گیا ہے۔ چاہے ہل چلاتے چلاتے ایڑیوں میں چپہ چپہ بھر دراڑیں پڑ گئی ہوں۔ یہ بتا۔ اب تک کچھ سامان بھی تیار کیا ہے کہ اپنے آپ کو ہی تیار کر رہا ہے؟"

بجھا ہوا پیارا پھر سے چمک اٹھا۔"بیوی سے ادھار کرے گا۔ کہہ دے گا۔ پہلے شادی کر لے پھر زیوروں کا بھی دیکھ لیا جائے گا۔"

"زیور تو بنے رکھے ہیں۔" نادر بالکل بچہ سا نظر آنے لگا۔"اماں پر کیسے کیسے برے وقت پڑے پر مجال ہے جو ایک چھلا بھی بیچا ہو۔ کہتی ہے شادی کے ایک سال بعد جو زیور اتارا ہے تو یہ کہہ کر اتارا ہے کہ اب بہو ہی پہنے گی۔ بیٹا برسوں بعد ملا پر بہو کا کنگن چوڑا پہلے سے تیار رکھا تھا۔ زیور ہے تو سب گلٹ کا۔ پر گلٹ بھی تو دھوپ میں چمک ہی جاتا ہے اور کنگن تو چاندی کے ہیں۔ میں نے ایک دن پہنے تھے۔ میرے پہنچوں پر بھی کھلے تھے۔ اماں کہتی ہے تیری منگیتر بڑے ہڈ کاٹھ والی ہے۔ اسے پورے آجائیں گے۔ پر پیارے سوچتا ہوں اگر اس کے پہنچے ہی یہ یہ ہوئے تو بازو کتنے ہوں گے! وہ تو مجھے مارے گی۔"

پیارا ہنسنے لگا۔

"بیوی بے چاری کیا مارے گی۔" بابا اللہ بخش بولا۔"ویسے نادرے زیور تو ہو گیا پر کپڑے کا کیا کیا؟ ان دنوں کپڑا تو کنجوس کا پیسہ ہو رہا ہے۔ کہ ملا ملا، نہ ملا نہ ملا۔"

نادر کے چہرے پر بہت سی اکٹھی رونق آ گئی۔"وہ تو بابا چھ سات سال سے جو آپ مالکوں کی خدمت کر رہا ہوں تو کچھ نہ کچھ تو ہوتا ہوا تا ہی رہا۔ ایسے ایسے رنگ رنگیلے کپڑے رکھے ہیں کہ جی چاہتا ہے سب گھنگھریاں لگی لنگوٹیں بنا ڈالوں اور ساری دنیا میں کبڈی کھیلتا

پھروں۔عام کپڑا چھونے سے میلا ہوتا ہے وہ دیکھے سے میلے ہوئے جا رہے ہیں۔''

نادر ذرا سا رک گیا۔پھر کچھ اداس ہو کر بولا۔''بس ایک مصیبت مارے ڈال رہی ہے۔اب جب ہم نے کوڑی کوڑی لگا دی ہے۔اور ادھر پیارے کے باپ سے سو روپیہ قرض بھی لے چکے ہیں تو لڑکی والوں نے کہلا بھیجا ہے کہ دولھا کے کپڑے بھی تمہی بنوا کے لاؤ۔پر کسی کو کانوں کان پتہ نہ چلے کہ تم لائے ہو۔اور ہمیں دے دو۔ہم نکاح کے بعد ان کپڑوں کو اپنا کہہ کر دولہا کو پہنائیں گے۔''

''انکار کر دو۔'' پیارے نے مشورہ دیا۔

''انکار تو کریں یار پر وہ کہتے ہیں کہ انکار کرنا ہے تو وہیں گھر بیٹھے رہو برات نہ لانا۔برات لاؤ گے تو گاؤں بھر کے کتے چھوڑ دیں گے۔

''پھر؟'' بابا اللہ بخش نے پوچھا۔

''پھر کیا بابا۔'' نادر نے بھیگی ہوئی دھجی کو مٹھی میں مسلتے ہوئے کہا۔''پیسہ پیسہ جمع کیا تھا کہ ذرا گولے وولے چلائیں گے۔پر ان سے ایک ریشمی لنگی۔۔۔''

''ریشمی لنگی؟'' بابا اللہ بخش نے ڈانٹنے کے انداز میں پوچھا۔

''نواب نادر علی کی شادی ہے نا بابا۔'' پیارے نے طنز کیا۔

''نہیں یار۔'' نادر بولا۔''یہ بات نہیں۔لڑکی والے کہتے ہیں کہ کپڑے بڑھیا ہونے چاہیں۔کہتے ہیں کپڑوں کے ساتھ جوتا بھی ہو۔اور جوتا زری کا ہو۔نوک سے ایڑی تک زری سے لپا تھپا ہو۔اندر تلے پر بھی زری کی بیلیں ہوں۔اور آج کل تم جانتے ہو۔ایسا لگتا ہے کہ زری زمین پر نہیں ہوتی۔سورج سے لانی پڑتی ہے قسم خدا کی۔یہ چمڑہ کاٹا ہے تو زری لپا جوتا ہی تو بنانے چلا ہوں۔انہوں نے کہلا بھیجا ہے کہ کپڑے جوتے ایسے ویسے ہوئے تو برات کو خالی ڈولی چلتا کر دیں گے۔''

''بڑے بدذات ہیں۔'' بابا اللہ بخش بولا۔

''آخر کمینے ہیں۔'' پیارے نے فقرہ کسا۔

اور نادر بالکل مرجھا سا گیا۔''ایسا نہ کہو پیارے۔کمین تو میں بھی ہوں پر قسم خدا کی۔خدا جھوٹ نہ بلوائے۔کمینہ نہیں ہوں۔سب کمین کمینے نہیں ہوتے پیارے۔پھول گھورے پر بھی اگ آتے ہیں۔''

پھر وہی گولہ چھوٹنے کے بعد کا سناٹا چھا گیا۔

نادر نچلے ہونٹ کے ایک گوشے کو اپنے دانتوں سے جیسے چبانے لگا۔بابا اللہ بخش اور پیارا زمین کو گھورنے لگے اور نادر نے سامنے رکھے ہوئے چمڑے کے بھیگے ہوئے ٹکڑے پر نظریں جما دیں۔اس وقت تینوں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔گلی میں سے ایک روتا ہوا بچہ ایک ہنستے ہوئے بچے کے پیچھے بھاگتا ہوا اور گالیاں دیتا ہوا گزر گیا۔

نادر کی بوڑھی ماں سر پر گھڑا رکھے دکان کے دروازے کے سامنے سے ہانپتی ہوئی گزری اور پھر ایک لحہ کو صحن کے دروازے میں

سے دکھائی دی۔ چڑیوں کا غول ایک پل کے لئے منڈیروں پر اترا اور ذرا دیر کو دھا چوکڑی مچا کر کہیں غائب ہو گیا۔

نادر اس تکلیف دہ سناٹے کو توڑنے کے لئے مٹی کا ایک برتن کو کھسکا کر اس میں سے تمبا کو نکالنے لگا کہ اچانک پیارا بولا۔ ''نہیں یار تو رہنے دے میرے پاس بھی تمبا کو ہے۔ تیرا تو آج کل ایک ایک پیسہ سو سو روپے کا ہے۔''

جلدی سے چلم کو تمبا کو سے بھر کر پیارے نے ایک دو کش لگائے اور حقہ بابا اللہ بخش کو دیا۔ اس نے یوں پھیکا سا کش لگایا جیسے رسم ادا کر رہا ہے پھر دونوں اٹھے اور۔ ''اچھا بھئی نادرے۔'' کہہ کر کچھ اس تیزی سے باہر نکلے جیسے ذرا سا رک کے تو واردات ہو جائے گی۔

نادر ایک لمحے تک دروازے میں سے باہر گلی میں دیکھتا رہا پھر اس نے پانی میں انگلیوں کی پوریں ڈبوئیں اور ان کو جھٹک کر چمڑے کے ٹکڑے پر پھوار سی برسا دی۔ پھر اس پر دھجی دوڑائی اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہہ کر تلے کی حد بندی کرنے لگا۔

بسم اللہ کر دی؟'' ماں نے صحن والے دروازے میں سے پوچھا۔

''کر دی اماں۔'' وہ بڑے بے جان انداز میں بولا۔

ماں اس کے لہجے سے چونک کر اندر آ گئی اور دونوں ہاتھوں کو اس کے دونوں گالوں پر رکھ کر اس کے چہرے کو اوپر اٹھایا۔ نادرے کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں اور وہ ضبط کرنے کی کوشش میں نچلے ہونٹ کا ایک گوشہ چبائے جا رہا تھا۔

''تھپڑ مار دوں گی۔'' ماں نے ایک ہاتھ تان کر کہا۔ ''اتنی گزر گئی۔ اب ذرا سی باقی ہے تو آنسو نکلے پڑ رہے ہیں یہ جوتا جلدی سے تیار کر لو پھر دیکھو کیا ہوتا ہے۔ خدا کی ذات بڑی بے پرواہ ہے بیٹے پر اتنی بے پروا بھی نہیں کہ اپنے موچی کی شادی عزت سے نہ ہونے دے۔ دیکھ لینا۔ رووٗمت بیٹے، آنسوؤں میں بینائی بہہ جاتی ہے اور زری کے مہین تار کے کرتب کھانے والوں کی بینائی نہ رہے تو کوئی بھیک بھی نہیں دیتا۔ کہتے ہیں اندھا نہیں ہے اندھا بنتا ہے۔ مفت کی تھونس ٹھونس کرا پھر گیا ہے۔ سنا؟ رووٗمت۔''

اور جب نادر نے ماں کی طرف دیکھا تو وہ آنسوؤں سے اپنی ساری جھریاں چمکائے بیٹھی تھی۔ پھر وہ جیسے گھبرا کر اٹھی اور صحن مے چلی گئی

زری کا یہ جوتا تیار کرنے میں نادر نے دن رات ایک کر گئے۔ صبح سے لے کر شام تک۔ ''پنا۔'' لئے روشنی کا تعاقب کرتا رہتا اور جہاں بھی ذرا زیادی چمک دکھائی دیتی بیٹھ جاتا اور پتلے کاغذ ایسے چمڑے پر زری چڑھانے میں یوں ڈوب سا جاتا۔ جیسے زمین میں سل کر رہ گیا ہے۔ سوئی کی سی باریک آر چر چر کرتی چمڑے میں گھستی۔ نیچے سے اس کا سرا اوپر آتا۔ اور زری کے تار کو نیچے لے جاتا پھر آرا اور دھاگے کی سوئی آپس میں الجھ کر ہٹ جاتیں اور یوں زری کے باریک بخئے کی ایک منزل طے ہوتی۔

راتوں کو وہ کڑوے تیل کے چراغ کے پاس گھس کر بیٹھ جاتا اور جب آدھی رات کو کمہاروں کا گدھا پہلی بار ہنکتا تو ماں منہ پر سے لحاف ہٹا کر کہتی۔ ''اب سو جاؤ بیٹے۔ آدھی رات گزر گئی۔ گدھا بولا ہے۔''

اور نادر ماں کو باتوں میں لگا لیتا۔ ''اماں یہ گدھا ٹھیک آدھی ہی رات کو کیوں بولتے ہیں؟ ایسا لگتا ہے جیسے راجہ شیر خان کے بیٹے کی طرح ان کے پاس بھی گھڑیاں ہیں کہ وقت دیکھا اور رینگنے لگے۔''

''شریر کہیں کا۔'' ماں کہتی وہ بہل جاتی یا اپنے آپ کو بہلا لیتی۔ بہر حال وہ کروٹ بدل لیتی لیکن نادر کو بار بار ٹوک کر اس بات ثبوت پیش کرتی رہتی ک وہ اکیلا نہیں ہے۔

پھر جب مرغ بانگ دیتا تو وہ کہتی۔'' بیٹے۔آج کل رمضان شریف ہوتا تو اس وقت میں سحری کے لئے اٹھ بیٹھتی۔اب سو جاوٗ۔اب نہیں سووٗ گے تو دن کو کون آ کر زری چڑھائے گا بھولے بادشاہ۔''

پھر وہ سو جاتا اور صبح ہوتے ہی پھر وہی چکر شروع ہو جاتا۔

اور جس روز جوتا مکمل ہو گیا اور نادر نے اس میں لکڑی کے کالبوت ٹھونس کر اسے دھوپ میں رکھا تو بڑھیا دیوار سے لگی بیٹھی چنگیر میں مہندی کی پتیاں ڈالے تنکے چن رہی تھی۔ جوتے کو دیکھا تو بلبلا اٹھی۔''انہیں میری آنکھوں کے سامنے سے ہٹا لو بیٹے۔ وہ چلائی۔''

نادر لپک کر دروازے میں آ گیا۔اور منہ پھاڑے دم بخود کھڑا ہو گیا۔

''ہٹا لو بیٹا۔'' وہ بولتی گئی۔''نہیں ہٹاوٗ گے تو میری پتلیاں تڑاخ سے ٹوٹ جائیں گی۔اتنی عمر ہو گئی۔خدا جھوٹ نہ بلوائے تو زری کو سو دو سو جوتے اپنے ہاتھوں میں سے گزار چکی ہوں پر قسم کھلوا لو جو ایسی چمک کسی دوسرے جوتے کی زری میں دیکھی ہو ایسا لگتا ہے سورج دو ٹکڑوں میں بٹ کر کھڑکی میں اتر آیا ہے۔زری چمکتی ہے۔کرنیں نہیں چھوڑتی۔ پر یہ زری تو کرنیں چھوڑ رہی ہے یہاں مجھ تک آ رہی ہیں کرنیں یہ تو نے کیا کیا بیٹے؟ اتنی سی عمر میں ایسا ہنر تو بڑے بڑے موچی سے بھی تمہارا ہاتھ چموا لے۔'' پھر وہ بھاگی بھاگی آئی۔دونوں جوتے دونوں ہاتھوں میں اٹھائے اور انہیں ایک ایک بار چوم کر وہیں رکھ دیا۔پھر اس نے نادر کے ہاتھ چوم لئے اور بولی۔'' آخر میرے حلالی بیٹے ہو نا۔''

''پر اماں۔'' نادر بولا۔اب دیکھو کیا ہوتا ہے۔''

''ہوتا کیا ہے۔'' بڑھیا بولی جیسے بیٹے کا مذاق اڑا رہی ہے۔''پرسوں برات کا تماشہ دیکھنے والوں کی نظریں بندھ کر رہ جائیں گی۔تمہارے پاوٗں سے چمڑا تو کہیں سے دکھائی نہیں دیتا۔لگتا ہے جوتا خالص سونے کا ہے۔موچی نے نہیں بنایا سنار نے سانچے میں اتارا ہے۔انصاف کی بات ہے۔''

''دعا کر اماں۔'' نادر پھر اسی لہجے میں بولا۔

''پگلا۔'' بڑھیا نے اس کا ہاتھ پیار سے جھٹک دیا۔اور دیوار کے پاس جا کر مہندی کی پتیوں پر جھک گئی۔

اس روز دن ڈھلے جب نادر نے جوتوں سے کالبوت نکالے تو بڑھیا بولی۔''اب ذرا سا پہن کر تو دکھاوٗ۔''

جوتا پہننے سے پہلے نادر پر کچھ عجیب ڈراوٗنی کیفیت طاری ہو گئی۔ پھر اس نے جوتا پہنا تو بڑھیا بولی۔''دشمن زیر، سجن ڈھیر، کانٹا تو نہیں۔''

''نہیں۔''

''تو پھر ٹھیک ہے۔''

''ٹھیک تو ہے پر۔۔۔۔۔''

اور پھر نادر چنگیر میں جوتا رکھے اور جوتے پر ریشمی رومال پھیلائے گھر سے نکلا تو بڑھیا نے دروازے پر سے کہا۔''فی امان اللہ۔''

نادر رک گیا اور پلٹ کر بولا۔''اماں۔اگر وہ نہ مانا۔پھر؟''

''پھر کیا؟'' بڑھیا بولی۔''تو کیا اب اللہ اپنے موچی کی شادی بھی نہیں ہونے دے گا؟ جا۔''

ایک گلی میں گزرا تو ادھر پیارا کندھے پر ہل رکھے، ایک نہایت منہ زور بیل کی رسی پکڑے بیل کے پیچھے گھسٹتا ہوا اڑا آ رہا تھا۔وہ اس کے پاس سے تیزی سے گزرتے ہوئے بولا۔''مجھے پرسوں کی تاریخ یاد ہے نادرے میں کل آؤں گا تمہارے پاس۔کوئی کام وام ہو تو بتانا اچھا۔''

''جیو پیارے۔''نادر بولا۔

''اور یہ کیا اٹھائے لئے جا رہے ہو؟''اس نے بہت آگے جا کر پوچھا اور پھر تیزی سے دوسری گلی میں مڑ گیا۔

اگلی گلی کی نکڑ پر بابا اللہ بخش ایک مجمع لگائے بیٹھا تھا۔''یہ کیا اٹھائے لئے جا رہے ہو نادرے؟''اس نے نادر کے چپکے سے کھسک جانے کے ارادے پر خاک ڈال دی۔

''کہاں چلے؟''

''بس یہیں تک بابا۔''نادر نے گول مول جواب دے کر بات ٹالنی چاہی۔

''یہ کیا اٹھا رکھا ہے۔''بابا نے پوچھا۔

''جوتا۔''نادر نے سچ بول دیا۔اور پھر گھبرا کر جانے لگا۔

''وہی جوتا؟''بابا اللہ بخش نے آواز دی۔

''ہاں بابا۔''نادر نے تیز تیز چلنے لگا جیسے بابا اللہ بخش اس نے جوتا چھیننے آ رہا ہے۔

''شادی والا؟''بابا کی آواز بلند ہو گئی۔

نادر دور نکل آیا تھا اس لئے کچھ نہیں بولا۔

''ارے کوئی کام وام ہو تو بتانا۔''بابا پوری شدت سے پکارا۔

نادر چوپال کی طرف مڑ گیا۔

اور بابا اللہ بخش نے ایک موچی چھوکرے کے ہاتھوں بھرے مجمعے میں اپنی بھد ہوتے دیکھ کر ساری بات کو قہقہوں میں اڑانے کی ٹھانی وہ بولا۔''شادی سے پہلے آدمی ہوا کے گھوڑے پر سوار ہوتا ہے۔شادی کے وقت اصلی گھوڑے پر سوار ہوتا ہے اور شادی کے بعد خود گھوڑا ابن جاتا ہے۔''لوگ بے تحاشا ہنسنے لگے۔

نادر چوپال پر پہنچا تو راجہ شیر خان پلنگ پر کچھ یوں پھیل کر لیٹا ہوا تھا کہ اگر وہ دوسرا پلنگ بھی ساتھ لگا دیا جاتا تو یہ پھیلاؤ اس کا بھی

احاطہ کر لیتا۔ آس پاس لوگوں کا ہجوم تھا۔ اور بات نئے تھانیدار کی خطرناک دیانتداری کی ہو رہی تھی۔ نور دادا کہہ رہا تھا۔ ''قتل کو بالکل ننگا کر کے رکھ دیتا ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ قتل بھی کوئی کھولنے کی چیز ہے۔ پھر یہ تھانیدار تو یہ بھی نہیں دیکھتا کہ قاتل کس خاندان سے ہے اور کہیں اس کی دس بیس مربع زمین تو نہیں۔ سب کو ایک لاٹھی سے ہانکتا ہے۔ تھانے کا خدا ہے۔''

''اس کا مطلب تو یہ ہوا۔'' راجہ شیر خان بولا۔ ''کہ دشمن چاہے تمہارے سامنے ڈنٹر پیلتا پھرے۔ تم اسے ٹھکانے نہیں لگا سکتے۔ ٹھکانے لگاؤ گے تو خود ٹھکانے لگ جاؤ گے۔ چاہے تمہارے پاس سرکاری خدمات کی کتنی ہی سندیں کیوں نہ ہوں۔ اب کے بڑے کپتان کو آنے دو۔ میں اس کے کان میں یہ بات ڈال دوں گا کہ تھانے دار بے شک اپنا فرض بجا لائے پر یہ تو دیکھ لے کہ ملزم خاندانی آدمی ہے کہ کمین ہے۔''

اچانک راجہ شیر خان کی نظریں نادر پر پڑیں وہ ڈھکی ہوئی چنگیر سے چونکا نہیں۔ راجہ شیر خان کے ہاں نیا جوتا جب بھی سل کر آیا سی ڈھب سے آیا۔

''لے آئے بھئی موچی۔'' اس نے پوچھا۔

''جی۔'' نادر بولا۔

''لا رکھ دے۔ پہنا۔'' راجہ شیر خان نے اپنے پھیلاؤ کو سمیٹا۔

''ایک عرض ہے۔'' نادر نے ہولے سے کہا اور اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔

''بول۔'' راجہ بولا۔

''ادھر مالک ذرا ایک طرف بات کرنی ہے۔'' نادر کے چہرے کی زردی میں نیلاہٹ نمودار ہونے لگی۔

''اچھا!'' راجہ شیر خان زری کے پرانے جوتے کی ایڑیوں کو اپنی ایڑیوں سے روند کر انہیں سلیپر کی طرح گھسیٹتا ہوا چوپال کی کوٹھڑی کی طرف جانے لگا۔ ''تم بھی پردے میں بات کرنے کی عمر کو آ پہنچے؟'' اس نے نادر سے پوچھا اور پھر پلٹ کر داد طلب نگاہوں سے مجمعے پر نگاہ ڈالی۔ لوگ یہاں سے وہاں تک مسکرانے لگے۔

''اس کی شادی ہے ناکل پرسوں۔'' نور دادا بولا۔ ''اسی لئے نخرہ بڑھ گیا ہے۔''

نادر کے سر پر جیسے نور دادا نے پیچھے سے دھول جڑ دی اور دہلیز پر سے ٹھوکر کھا کر کوٹھڑی کے اندر لڑکھڑا کر جا پہنچا۔

اس نے چنگیر پر سے رومال ہٹایا اور جوتے کو یوں ہولے سے دو انگلیوں کی پوروں میں اٹھا کر مونڈھے پر بیٹھے ہوئے راجہ شیر خان کے سامنے لے گیا۔ جیسے ذرا سا جھٹکا لگا تو جوتا کرچی کرچی ہو جائے گا۔''

''واہ!'' راجہ شیر خان تڑپ اٹھا۔ ''دیکھنے میں تحفہ ہے۔ بڑا باریک کام کیا ہے تو نے موچی۔ بالکل مشین کا کام لگتا ہے۔ جیسے سونے کی پتری ٹھپا لگا کر چڑھا دی ہے۔ واہ۔ اب پہنا بھی تو۔''

نادر نے راجہ کو جوتا پہنایا۔ راجہ اٹھ کر چند قدم ادھر ادھر چلا اور مونڈھے پر بیٹھ گیا۔

''اچھا ہے بھئی موچی۔ بہت اچھا ہے۔ بہت پسند آیا۔''

''راجہ جی۔'' نادر نے سمٹ کر، بالکل ذرا سا ہو کر کہا۔

''کہو۔''

''پرسوں میری شادی ہے۔'' وہ بولا۔

''وہ تو ابھی ابھی نور دادا نے جو بتایا ہے۔''

''میں نے راجہ جی آپ کی بڑی خدمت کی ہے۔'' نادر جیسے حتیٰ المقدور اپنے مقصد کو ٹالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''پھر؟''

''میرے باپ نے تو آپ کے اور بڑے راجہ جی کے قدموں میں عمر گزار دی۔'' نادر نے کہا۔

''ہاں۔'' ''اچھا مٹا ہوا کمین تھا۔'' راجہ نے کہا۔

''بات یہ ہے جی۔'' نادر رک رک کر بولنے لگا۔ ''میں نے زیور کپڑا سب کچھ تیار کر لیا۔ آج کتنے برسوں سے میں اور میری ماں محنت کر رہے ہیں۔ کوڑی کوڑی کر کے جو کچھ جمع کیا وہ لگ گیا۔''

''لگ گیا ہوگا۔ پہلے روپیہ بچتا تھا۔ اب لگتا ہے۔'' راجہ شیر خان بولا۔

''اب جی۔'' نادر کی آواز سرگوشی کی حد تک گر گئی۔ ''لڑکی والے کہتے ہیں کہ دولھا کے کپڑے بھی ہمیں تیار کرائیں اور کسی کو پتہ ہی نہ چلے کہ ہم نے تیار کرائے ہیں۔''

''کمین لوگ لڑکی دینے لگیں تو ایسی ہی کمینی باتیں کرتے ہیں۔'' راجہ شیر خان نے افلاطونیت چھانٹی۔

''وہ کہتے ہیں۔'' نادر بولا۔ ''کپڑے ایس ویسے نہ ہوں۔ بہت اچھے ہوں۔ اور جوتا بھی زری کا۔''

''زری کا جوتا؟'' راجہ نے پوچھا۔

''جی۔''

''پھر؟''

''پھر جی۔'' نادر نے راجہ شیر خان کے چہرے پر نظریں ہٹالیں اور اس کے نئے جوتے پر گاڑ دیں۔ ''پھر جی اگر آپ کا یہ جوتا ایک دن کے لئے مل جائے تو ناک رہ جائے میرے گھر کی۔''

''وہ؟؟'' راجہ شیر خان نے پرانے جوتے کی طرف اشارہ کیا۔

''جی یہ۔'' نادر نے نئے جوتے کی نوک چھو لی۔

''یعنی تم میرا یہ نیا جوتا پہنو گے؟'' راجہ گرجتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور پھر دروازے پر جا کر جیسے ہجوم کے سامنے تقریر کرنے لگا۔ ''یہ موچی چھوکرا میرا جوتا اپنے پاؤں میں پہننا چاہتا ہے یارو۔ کہتا ہے میری شادی ہو رہی ہے ذرا سا پہن لینے دو کہ ٹھاٹھ رہ جائے گی۔ بدذات۔''

''ہجوم پر گولہ چھوٹنے کے بعد کا سناٹا چھا گیا۔

راجہ شیر خان اپنے پلنگ کی طرف جانے لگا اور نادر کوٹھڑی کے دروازے میں سے نکل کر دیوار کے ساتھ جیسے جم گیا۔

راجہ بولتا چلا گیا۔''میرا جوتا میرے پاؤں اور ان کمینوں کے سروں کے لئے ہوتا ہے۔''وہ پلنگ پر جا کر پھیل گیا۔''جی چاہتا ہے اسی جوتے سے چمڑی ادھیڑ ڈالوں اس کی کتا۔کمینہ۔''پھر اس نے مڑ کر نادر کی طرف دیکھا اور کڑکا۔ادھر مر۔''

نادر آہستہ سے چلتا ہوا پلنگ کے پاس آ گیا۔

''پھر ایسا حوصلہ کیا تو چروا کے ڈال دوں گا۔''راجہ نے گھر کا۔

ذرا سے وقفے کے بعد نادر بولا۔''قصور ہو گیا مالک۔''

''چل ہٹ یہاں سے۔''راجہ گرجا۔

نادر بولا۔''اگر اس جوتے کے دام مل جاتے راجہ جی تو میں جلدی جلدی سے اپنے جوتے کا کوئی انتظام۔۔۔۔''

''دام؟''راجہ شیر خان کی آواز گونجنے لگی۔''یعنی نقد دام مانگتا ہے؟ آج تک راجہ شیر خان سے کسی نے نقد دام مانگے ہیں جو تو مانگنے چلا ہے۔غضب خدا کا۔دو پیسے کا جوتے گانٹھنے والا اور ساٹھ روپے کا جوتا پہنے بغیر ناک کٹی جا رہی ہے۔چل دفع ہو یہاں سے۔منشی جی۔لکھ لو۔اگلی فصل پر اس موچی کو پندرہ بیس روپے کی گندم تلوا دینا۔''

KORNER
FRIENDSKORNER.COM

ہیرا

"اور پھر شاہزادی نے تنگ آ کر ہیرا چاٹ لیا۔"

چھپر تلے کچھ دیر تک خاموشی رہی۔

زینو بچے کو گود میں دودھ پلا رہی تھی۔اس نے اوڑھنی کے نیچے ہی بچے کو دائیں سے بائیں گھمایا اور بولی۔"رک کیوں گئے؟ پھر کیا ہوا؟"

وریام زور سے ہنسا۔"مزا آ گیا کہانی سنانے کا۔" وہ قہقہوں کے درمیان بولا۔

۔۔۔۔"زینب بی بی کو پتہ ہی نہیں چلا کہ میں کیا کہہ گیا۔"

زینو جھینپ گئی۔"میں پوچھتی ہوں ہیرا چاٹ لینے کے بعد کیا ہوا شہزادی کو؟"

وریام دگنی شدت سے ہنسا۔پھر ایک دم سنجیدہ ہو کر آہستہ سے بولا۔"ہولے ہولے پگلی۔کسی پڑوسن نے سن لیا بھد ہو گی،سب کہیں گے وریام کی بیوی کی عقل گھاس چرنے گئی ہے۔"

زینو کی جھینپ بوکھلاہٹ میں بدل گئی۔"پچ نکالنے کی تو عادت ہے تمہاری۔" پھر یہ بوکھلاہٹ غصہ بنی اور یہ غصہ بچے پر اترا۔زینو نے بچے کو اوڑھنی کے نیچے سے کھینچ کر زمین پر لٹا دیا اور بولی۔"چمٹ کر رہ جاتا ہے کم بخت۔جیسے لہو تک نچوڑ لے گا۔"

بچہ رونے لگا۔وریام نے پلنگ پر سے پھاند کر بچے کو اٹھا لیا۔اور اسے کندھے سے لگا کر ادھر ادھر ٹہلتے ہوئے زینو کو سمجھانے لگا۔"یوں نوچ کے نہیں پھینک دیتے۔اس طرح بچے کی آنکھوں میں پیاس آ جاتی ہے۔"

مرد کو اپنی مملکت میں داخل ہوتا دیکھ کر عورت چلا اٹھی۔"بس بس رہنے دو۔بچے کو دودھ پلانا مرد کے ذمے ہوتا تو جب میں دیکھتی کیسے چمٹائے پھرتے دن بھر۔۔۔۔ادھر لاؤ۔"

زینو نے بچہ چھین لیا۔ماں کی بانہوں میں آتے ہی خاموش ہو گیا اور وریام پلنگ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔"بڑا سخت زمانہ آنے والا ہے زینو۔یہ بچے کل بڑے ہوں گے تو ایسے ایسے کام لئے جائیں گے ان سے ہم تم سوچیں بھی تو دماغ پھٹ جائیں۔اسے خوب دودھ پلاؤ۔خوب تندرست رکھو۔کہیں ایسا نہ ہو کہ توپ کا گولا ایک فرلانگ پر پھٹے اور وریام خان کے صاحب زادے دھماکے ہی کے زور سے تنکے کی طرح اڑ کر دور جا گریں۔

میں نے ایسے سپاہی بھی دیکھے ہیں کہ ادھر دھماکہ ہوا ادھر ہوا کا ایک جھکڑ چلا اور سپاہی نے ایسی پٹخنی کھائی کہ جنگ کے میدان میں بھی ہنسی آ گئی۔ایسے جوانوں کو تو کوئی اخبار و خبار چھاپے چھوپے پر لگا دینا چاہیے۔"

"اور تم؟" زینو نے پیار بھرے جذبہ انتقام سے پوچھا۔"تمہیں گولے کا دھماکا کتنی دور جا پھینکتا ہے؟"

"میں؟" وریام پلنگ پر سیدھا بیٹھ گیا۔"گولے سے اڑ جاؤں تو دوسری بات ہے۔پر جس روز دھماکے سے اڑا تو اس بیٹے کی قسم ہے۔اپنے پیٹ میں سنگین بھونک لوں گا۔"

"بکو نہیں۔" زینو بگڑ گئی۔

"خدا کی قسم ہے زینو۔ ایسا ہو تو ہیرا چاٹ لوں۔"

"کیا؟"

"ہیرا چاٹ لوں۔"

"ارے ہاں" زینو کو کہانی یاد آ گئی۔ "شاہزادی نے ہیرا چاٹ لیا تو پھر کیا ہوا؟"

وریام فوراً بولا۔ "وہ مر گئی۔"

"شاہزادی مر گئی۔ ہیرا چاٹنے سے ما جاتے ہیں نا۔"

"ہیرا چاٹنے سے مر جاتے ہیں؟"

"ہاں۔"

"ارے!"

مارے جھینپ کے اب کے زینو کافی دیر تک خاموش رہی پھر سوئے ہوئے بچے کو آہستہ سے پلنگ پر لٹا کر وہ وریام کے پاس بیٹھ گئی اور ذرا سا ہنس کر بولی۔ "تم تو اسی لئے ہنس رہے تھے؟"

وریام بھی ذرا سا ہنس دیا۔

"کتنے میں آتا ہے ہیرا؟" زینو نے وریام کے بازو سے لگ کر پوچھا۔

اور وریام نے بڑی رواداری میں کہا۔ "یہی کوئی۔۔۔۔بس یوں سمجھ لو کہ۔۔۔۔۔۔۔اگر میں بھی بک جاؤں نا۔ اور تم بھی اور ننھا بہرام بھی۔ اور یہ مکان اور چھپرا اور۔۔۔۔یعنی ہمارا سب کچھ بک جائے نا۔ جب بھی ہیرا نہیں ملے گا۔ صرف بادشاہوں، بادشاہزادوں کے پاس ہوتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے لوگ تو گاڑیوں کے نیچے آ کر مرتے ہیں یا افیم کھا لی یا سنکھیا پھانک لیا۔ امیر لوگ ہیرے چاٹ کر مرتے ہیں۔ امیروں کی موت بھی شاندار ہوتی ہے کیسے مرا؟ بس ہیرا چاٹ کے مر گیا۔ اہاہاہا۔ یہ نہیں کہ ریل گاڑی کے نیچے لیٹ گئے۔ انتڑیاں ایک پٹڑی پر ڈھیر پڑی ہیں۔ سر دوسری پٹڑی کی طرف لڑھک گیا ہے اور چھڑا انجن کے پہیوں سے لپٹا جا رہا ہے۔۔۔۔تھوہ!"

"بھاڑ میں ڈالو ہیرے کو" زینو مارے خوف اور گھن کے پکاری۔ "کوئی اور بات کرو۔ ایسی اچھی سی کہانی سنائی اور ایسی گندی باتیں کرنے لگے ہو آخر میں۔ تمہیں کیا ہو گیا لام جا کر؟"

لام جا کر وریام کو سچ مچ کچھ ہو گیا تھا۔ اول درجے کا لٹھ مار رنگون اور سنگاپور کا چکر لگا کر اب ایسی پتے کی باتیں کرنے لگا تھا کہ چوپال پر اس کی باتیں سننے والے اس کے آس پاس سمٹ آتے اور جب محفل برخاست ہوتی تو گھروں کو جاتے ہوئے کہتے۔ "روپیہ بھی کما لایا اور علم بھی سیکھ آیا۔ چھپر یونہی پھٹتے ہیں۔" زینو وریام کی تین مہینے کی چھٹی کے شروع دنوں میں سخت چکرائی ہوئی پھرتی رہی لیکن آہستہ

آہستہ دونوں میں ذہنی سمجھوتہ ہو گیا اور زینو اس کی باتوں میں دور کی کوڑیاں چننے کے بجائے پڑسنوں سے فخریہ کہتی۔ ''وہ تو انگریزی بھی بولتا ہے۔لکھتا بھی ہوگا۔میں نے پوچھا نہیں۔پوچھوں گی۔گورے اسے خط لکھتے ہیں۔میمیں اسے سلام بھیجتی ہیں۔اب جائے گا تو بغداد شریف کی زیارت بھی کرے گا۔ولایت بھی جائے گا۔بادشاہ سلامت سے ہاتھ ملائے گا۔میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتی ہوں۔''

وریام چلا گیا۔

ایک برس کے بعد وریام واپس آ گیا۔

اس کی واپسی کا واقعہ بڑا عجیب ہے۔

وہ اپنے گاؤں کے اسٹیشن پر اترا مگر کچھ یوں جیسے اسے زبردستی اتارا جا رہا ہے۔پھر وہ پکارا۔''بھئی یہ میرا گاؤں کیسے ہو سکتا ہے۔ایک دم وہ پلیٹ فارم پر سرپٹ بھاگنے لگا۔وہ لکڑی کے جنگلے پر سے کود گیا۔سینے کے بل گرا اور اٹھا نہیں بلکہ یوں ہی سینے کے بل رینگتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے گاؤں والے اس کی طرف بڑھے مگر گاڑی کے دروازے میں کھڑے ہوئے ایک فوجی جوان نے انہیں اپنے پاس بلایا اور ان سے کوئی ایسی بات کی کہ وہ جہاں کھڑے تھے وہیں جم گئے۔پھر اس نے ایک بستر اور۔۔۔۔بکس گاڑی سے اتار کر گاؤں والوں کے حوالے کیا اور رومال سے آنکھیں پونچھتا ہوا چلتی گاڑی میں سوار ہو گیا۔

رینگ رینگ کر آگے بڑھتے ہوئے وریام کے ارد گرد اب کے بچے جمع ہونے لگے تھے۔وہ پہلے تو بے خبری میں رینگتا گیا مگر اچانک جب اس نے اپنے سامنے بچوں کے سائے دیکھے تو وہ چیخ کر بولا۔''لیٹ جاؤ بیوقوفو۔''

بچے پہلے تو اس گرج سے دہل گئے مگر پل بھر بعد ایک ساتھ ہنسنے لگے اور پھر جب انہیں سامنے سے زینو بہرام کو کولھے پر رکھے دوڑتی ہوئی اس کی طرف آتی دکھائی دی تو سب بھاگ کھڑے ہوئے۔اس وقت وریام گاؤں کے کیکر کے سب سے بڑے درخت شاہ کیکر نے نیچے پہنچ گیا تھا۔

وریام نے زینو اور بہرام کو دیکھا تو چیخ کر بولا۔''لیٹ جاؤ۔''

زینو بالکل بین کے انداز میں پکاری۔''تمہیں کیا ہو گیا وریام۔یہ تم کیا بن کر آ گئے لام سے؟''

وہ بہرام کو وہیں خاک پر بٹھا کر دھڑا دھڑ اپنا سینہ پیٹنے لگی۔پلیٹ فارم کے جنگلے پر سے لوگ چھلانگیں لگاتے ہوئے آئے اور ان کی طرف لپکے اور وریام یونہی لیٹے لیٹے چیختا رہا۔

''میں کہتا ہوں لیٹ جا کمینی زمانے بھر کی۔اندھی ہے کیا؟دیکھتی نہیں جاپانیوں کی گولیاں ہر طرف سے سن سن نکلتی جا رہی ہیں؟''

اور جب بھاگتا ہوا ہجوم ان کے قریب پہنچ رہا تھا وہ اٹھا اور بولا۔''نہیں لیٹے گی؟''

پھر اس نے تڑ سے زینو کے منہ پر تھپڑ مار دیا اور ایکا ایکی اس کے چہرے پر ہلدی کھنڈ گئی۔اس کی آنکھوں میں بڑا دراؤنا پھیلاؤ نمایاں ہونے لگا۔اس کی کنپٹیوں کی رگیں پھول گئیں اور وہ ایک دم یوں بچوں کی طرح بلبلا کر رو دیا کہ زینو اتنے بہت سے لوگوں کے سامنے اس سے لپٹ گئی۔اسے کھینچ کر بٹھا لیا اور بھرائی اور بھیگی ہوئی آواز میں بولی۔''اِسھر تو دیکھو وریام۔یہ بہرام ہے۔تمہارا بیٹا پہچانتے

ہوا سے؟"

وریام نے اثبات میں سر ہلایا اور روتے ہوئے بہرام کو اٹھا کر سینے سے بھینچ لیا۔

زینو بولی۔"اور یہ درخت کون سا ہے؟"

"شاہ کیکر ہے۔" وریام بولا۔"کیا بچوں کی سی باتیں کر رہی ہو۔"

زینو اتنے بہت سے آنسوؤں میں بھی مسکرا رہی تھی بولی۔"اور یہ میں ہوں۔ جانتے ہو؟ یہ میں ہوں میں۔ بھلا بتاؤ تو میں کون ہوں؟"

"زینو اور کون؟" وریام کے خشک ہونٹوں پر پہلی بار مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

آس پاس کھڑے ہوئے لوگ بھی مسکرانے لگے۔

"شکر ہے خدا کا۔" ایک بولا۔

"یہ تو کوئی ایسی بات نہ ہوئی۔ ٹھیک ہو جائے گا۔" دوسرے نے رائے ظاہر کی۔

"جو لام سے جیتا جاگتا لے آیا وہ یہاں بھی فضل کرے گا۔" ایک بوڑھے نے کہا۔

وریام نے اوپر دیکھا۔ پھر جیسے اچانک کچھ یاد آتے ہی اس نے بہرام کو گود سے اتارا اور اٹھ کر سب سے بڑے تپاک سے ملا۔ انہیں ان کے ناموں سے پکارا۔ اسے تو ان کے بچوں تک کے نام یاد تھے۔ اسے تو یہ بھی یاد تھا کہ ننھے خاں میراثی کی بیوی کسے کے ساتھ کہیں بھاگ گئی تھی۔ مگر ہر سال کسی نہ کسی کے ہاتھ ننھے خاں کو پیار بھجواتی تھی۔"اب بھی پیار آتے ہیں؟" اس نے ننھے سے پوچھا اور ننھا بولا۔"اب تو وریام خاں، ہر سال پیار کے ساتھ ایک بچے کی خبر بھی آ جاتی ہے۔ اور اس سال تو اکٹھے دو ہوئے تھے اور وہ بھی مذکر۔" سب لوگ بے اختیار ہنسنے لگے۔ پھر وریاں نے بہرام کو اٹھایا اور سامنے اپنے گھر کی طرف جانے لگا۔ زینو نوچے ہوئے بالوں اور کوٹے ہوئے سینے کو چادر سے ڈھانکتی اس کے پیچھے چلنے لگی۔ پھر دو آدمیوں نے واپس جا کر پلیٹ فارم پر سے وریام کا بکس اور بستر اٹھایا اور جب وہ وریام کے گھر پہنچے تو وہ چھپر تلے پلنگ پر بیٹھا شیشے کے گلاس میں لسی پی رہا تھا۔ اور بہرام نے اس کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اسے ادھیڑ ڈالا تھا۔

وریام نے لسی پی اور بچے کو پیٹ پر بٹھا کر لیٹ گیا۔ فوراً ہی وہ سو گیا اور زینو نے بہرام کو آہستہ سے اس کے پیٹ سے اتار لیا۔ وہ دن بھر دروازے پر بیٹھی گاؤں والیوں سے وریام کی عجیب وغریب بیماری کی باتیں کرتی رہی۔ چند لوگوں نے آ کر اسے بتایا کی کوئی خاص فکر کی بات نہیں۔ جس فوجی نے وریام کا بکس اور بستر ان کے حوالے کیا تھا وہ کہتا تھا کہ وریام پاگل تو بالکل نہیں۔ ذرا سا بیمار ہے۔"اس سے کوئی ایسی بات نہ کرنا جس سے اسے غصہ آ جائے۔ غصہ آ جائے تو اسے کچھ ہو جاتا ہے۔ ویسے وہ ٹھیک ہے۔ اکتالیس دن تک سائیں سبز شاہ کے مزار کی خاک پاک چاٹی تو پتہ ہی نہیں چلے گا کہ وہ کبھی بیمار بھی تھا۔ فکر کی ضرورت نہیں۔"

وریام دیر تک سوتا رہا۔ شام کی گاڑی آئی تو دور سے اس نے سیٹی بجانی شروع کی اور پلیٹ فارم تک یہ سیٹی نہ ٹوٹی۔ اس وقت گاؤں

کے ریوڑ چراگاہوں کو واپس آتے ہوئے ریلوے لائن عبور کرتے تھے۔اس لئے ریل کا انجن کو ہر روز اسی طرح چیخنا پڑتا تھا۔

گاڑی کی تیز سیٹی سے بھی وریام کی آنکھ نہ کھلی۔پھر جب گاڑی چلی گئی تو وریام کی آپی آپ آنکھ کھل گئی۔اس وقت بہرام کہیں اندر اس کے بکس کے تالے سے کھیل رہا تھا۔

وریام اٹھا۔زینو کو پکارا تو آواز آئی۔"یہاں تمہارے پاس ہی تو بیٹھی ہوں وریام۔"

وریام نے پلٹ کر دیکھا تو زینو اسی کے پلنگ کے پائے پر بیٹھی تھی۔

"کب سے بیٹھی ہو؟"

"دیر سے۔"

"کیا کر رہی ہو؟"

"تمہیں دیکھ رہی ہوں۔"

وریام نے جھٹ ہاتھ بڑھا کر اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔اس نے زینو کو اس زور سے کھینچا کہ وہ۔"ہائے میری سانس۔"ہائے میری پسلیاں۔" پکارتی رہی اور ٹانگیں پھڑ پھڑاتی رہی مگر وریام نے کافی دیر تک اسے اپنی گرفت سے آزاد نہ کیا۔پھر جب اس نے زینو کو چھوڑا تو وہ الگ ہٹ کر بولی۔"دروازہ کھلا تھا وریام۔کوئی آجاتا تو کیا ہوتا؟"

"آجاتا تو چلا جاتا۔" وریام نے ہنس کر کہا۔"پھر وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔اور بولا۔"ابھی تک چراغ نہیں جلایا؟"

"نہیں تو۔۔۔جلا دوں؟"

"نہیں۔مجھے تم سے ایک دو باتیں کرنی ہیں اندھیرے میں۔"

"کرو۔"

"میرے پاس آجاؤ۔" اس کی آواز اچانک بھرا گئی۔

زینو اس کے پاس آگئی۔

"زینو۔" وہ بڑی ہی گھٹی ہوئی آواز میں بولا۔"دیکھو۔" اس نے لجاجت سے کہا اور زینو اس پر جھک گئی۔اور اس کے بال اس کے شانوں پر سے گر کر وریام کے چہرے کو چھونے لگے۔

"سنو زینو۔" وریام رکتے ہوئے بولا۔

زینو لپک کر گئی۔دروازے کی زنجیر چڑھا کر بھاگتی ہوئی واپس آئی اور وریام کے گھٹنے پر ٹھوڑی رکھ کر اسے یوں دیکھنے لگی جیسے اس پر سے نگاہوں کی آرتی اتار رہی ہے۔

"سنو زینو۔" وریام بولا۔"جانے مجھے کیا ہو گیا ہے۔میرا ایک دوست تھا زینو۔میرے ساتھ مورچے میں تھا۔گولے برس رہے تھے۔گولے برستے رہے۔جب ذرا سی خاموشی ہوئی تو میں نے کہا۔"نواز اگر کوئی گولا ادھر ادھر گرنے کی بجائے یہاں میرے تمہارے

مورچے میں آ کر گرے تو ہمارے ادھڑے ہوئے جسم جانے کس جانور کی خوارک بنیں گے۔ میں نے یہاں خاموش راتوں میں گیدڑوں کو بھی روتے ہوئے سنا ہے۔ تو کیا ہم مسلمان جوانوں کے جنازوں کو گیدڑ کھائیں گے؟ ہوسکتا ہے ہماری لاشوں پر سے ٹینک گزر جائیں اور ہمارا چمڑا ان کے پہیوں سے لپٹ جائے اور سپاہی بیلچوں سے ہمارے چمڑے اور چربی کو ٹینک سے جدا کریں۔ ممکن ہے کہیں سے گدھیں۔۔۔۔"

زینو جو وریام کو خفا کر بیٹھنے کے ڈر سے اب تک ضبط کئے بیٹھی تھی۔ چیخ اٹھی اور وریام کے منہ پر ہاتھ اور اس کے چھاتی پر سر رکھ کر رونے لگی۔

وریام نے بڑے پیار سے اس کا چہرہ اٹھا کر آئینے کی طرح اپنے سامنے رکھ لیا اور بولا۔

"سنو تو۔ پھر کیا ہوا کہ گولوں کی ایک اور باڑ چلی۔ ہمارے گولے بھی ہمارے مورچے پر سے ہواؤں کو پھاڑتے ہوئے نکلے جا رہے تھے۔ ایک بار پھر دونوں طرف خاموشی چھا گئی۔

تو میں نے نواز کو پکارا۔ جواب نہ ملا تو مجھے فکر ہوئی کیونکہ وہ تو گولوں کے طوفان میں بھی کان پر ہاتھ رکھ کر علی حیدر کے دوہے گاتا رہتا تھا۔ میں اپنے مورچے سے نکلا اور سینے کے بل لیٹ کر رینگتا ہوا اس کے مورچے پر پہنچا۔ تو زینو۔ مجھے بہرام کی قسم ہے۔" وریام رک گیا اور بولا۔" اری وہ اکیلا اندر بیٹھا کیا کر رہا ہے۔ کیڑے مکوڑوں کی رت ہے۔"

"وہ تمہارے بکس کے اوپر بیٹھا ہے۔" زینو جلدی سے بولی۔

وریام نے فوراً کہانی کا ٹوٹا ہوا رشتہ جوڑا۔" بھئی زینو مجھے اس بہرام کی قسم ہے کہ وہاں مورچے میں سر کے سوا اس کے سارے جسم کو جیسے کسی نے بوٹیوں بوٹیوں کاٹ کر ڈھیر لگا دیا تھا۔ پھٹا ہوا چمڑا دھجی دھجی بن بکھرا پڑا تھا۔ اور ایک طرف اس کا سر پڑا تھا۔ چاند کی طرح پیلا اور بڑا ہی معصوم سا۔ جانے موت کے بعد نواز کا چہرہ بچے کے چہرے کی طرح چھوٹا سا اور بھولا بھالا سا کیوں ہو گیا تھا۔ تب زینو مجھے ایسا لگا کہ نواز نہیں مرا بہرام مر گیا ہے۔ اور یہ سپاہی نہیں مرا۔ ایک بچے کو کسی قصائی نے کاٹ ڈالا ہے۔ پھر مجھے ایک دم ایسا لگا کہ یہ نواز نہیں ہے۔ اور میں مر گیا ہوں اور میرے اندر کسی چیز نے میری بوٹی بوٹی کاٹنی شروع کر دی ہے۔ بھئی مجھے بہرام کی قسم زینو۔ مجھے تمہاری قسم ہے۔ خدا کی قسم ہے کہ اس وقت مجھے اپنے گوشت میں سے گزرتی ہوئی چھری کی چر چر کی آواز بھی سنائی دے گئی۔ بس اس کے بعد مجھے ہسپتال لے گئے اور جب سے سنا ہے کہ میں بکتا جھکتا رہتا ہوں اور بھاگ کھڑا ہوتا ہوں اور بھاگتے بھاگتے زمین پر دھب سے لیٹ جاتا ہوں۔ جانے کیا کیا بتاتے ہیں لوگ۔ پر زینو میں تو کچھ بھی نہیں کرتا۔ مجھے نیند آ جاتی ہے۔ مجھے تو یہ تک یاد نہیں کہ گاڑی سے اتار کر مجھے وہاں شاہ کیکر کے نیچے کون بٹھا گیا تھا۔ جہاں سارا گاؤں میرے گرد جمع تھا۔ یہ مجھے کیا ہو گیا ہے زینو۔ میں نے تو ایسی لاشیں بھی دیکھی ہیں جو اکڑتی ہیں تو اٹھ کر بیٹھ جاتی ہیں۔ پھولتی ہیں تو ذرا سا چھونے سے بھی بھیڑ وزن کی طرح باں سے بول اٹھتی ہیں۔ پر اس نواز نے تو۔۔۔۔ بھئی زینو۔ اب ذرا بہرام کو بلاؤ نا۔"

زینو جیسے کہیں دور سے بولی۔" بلاتی ہوں پر وعدہ کرو۔ اس سے ایسی ڈراؤنی باتیں نہیں کرو گے۔"

وریام گرجا۔ "تو کیا تم نے سچ مچ باؤلا سمجھ لیا ہے؟ تو کیا میں پاگل ہوں اچھا تو میں پاگل ہوں۔ کرلو جو کرنا ہے۔ میں پاگل ہوں۔ بلاؤ اسے۔ وہ کہاں ہے۔ اس سے کہو جہاں بھی ہے لیٹ جائے۔ دیکھتی نہیں جاپانیوں کی گولیاں ہر طرح سے سن سن کرتی نکلی جا رہی ہیں۔"

وہ پلنگ سے کود کر زمین پر سینے کے بل لیٹ گیا اور رینگتا ہوا مکان کے اندر جانے لگا۔ زینو پہلے تو بہرام کو بکس سے اٹھا لینے کے لئے بھاگی مگر پھر جانے اس کے جی میں کیا آئی کہ بچے کو اٹھا کر چیختے ہوئے وریام کے پاس آئی اور دم بخود بہرام کو اس کے پاس لٹا دیا۔ پھر خود بھی وہیں لیٹ گئی۔ "یوں۔" وریام بولا۔ "اب ٹھیک ہے۔ اب ہم محفوظ ہےں۔ گولا سیدھا ہمارے اوپر آ کر پھٹے تو دوسری بات ہے۔"

زینو کچھ دیر تک لیٹی رہی۔ پھر ڈرتے ڈرتے سر اٹھا کر دیکھا تو بہرام باپ کے بالوں سے کھیل رہا تھا۔ اور وریام گہری نیند سو رہا تھا۔ اور زینو باہر دیوار پر ٹھوڑی رکھ کر کھڑی ہوئی، پڑوسنوں کو وریام کے شور کا سبب بتانے آنگن میں چلی گئی۔

یہ سلسلہ مہینوں تک جاری رہا۔ وریام پر محض اس بات پر بھی پاگل پن سوار ہو جاتا تھا کہ پانی کے گلاس میں تنکا تیر رہا ہے۔ یا ترکاری میں نمک کم ہے۔ پھر ایک دم اس کے ذہن میں جاپانی گولیاں چلانے لگتے۔ اور وہ گھر میں میدان جنگ قائم کر دیتا۔ تھک ہار کر سو جاتا اور جب اٹھتا اور زینو سے ضد کر کے سارا حال معلوم کرتا تو اس کے زانو پر سر رکھ کر کئی بار بچوں کی طرح بلک بلک کر رو دیا اور بہرام کو سینے سے لگائے دیر تک آنگن میں ٹہلتا رہا۔

زینو بیس بیس کوس پیدل جا کر بڑے بڑے پیروں سے تعویذ لے کر آتی۔ اس نے سائیں سبز شاہ کے مزار پر سوجی کے حلوے کی کڑاہی چڑھائی اور روزانہ چٹکی چٹکی بھر خاک پاک لا کر وریام کو چٹاتی رہی۔ سنیاسیوں سے ٹوٹکے لئے اور تنکے سوئی پر چڑھا کر دواؤں کی غیر محسوس مقدار میں مکھن میں لپیٹ کر وریام کو کھلائیں۔ اس نے پانچوں نمازیں ادا کرنا شروع کر دیں۔ اور ہر نماز کے بعد جب دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتی تو خوب خوب روتی۔

پہلے پہل وریام نے اسے رونے سے روکا مگر پھر اس کا عادی ہو گیا۔ کہتا۔ "چلو رو لو زینو۔ یہ بھی کر دیکھو۔"

ایک دن اس نے دیکھا کہ بہرام زینو کے پاس بیٹھا مٹی کھا رہا ہے اور زینو اپنے ہی کسی خیال میں کھوئی ہوئی اس کی طرف تکے جا رہی ہے مگر اسے روکتی نہیں تو اس پر بلا کا پاگل پن سوار ہو گیا۔ اس نے گلاس اٹھا کر زینو کے سر پر دے مارا اور جب اس کے سر سے خون پھوٹ نکلا اور بہرام مٹی بھرا منہ کھول کر بلبلانے لگا تو وریام دھب سے زمین پر لیٹ گیا۔ اور چلایا۔ "لیٹ جاؤ کم بختو۔ رونے رلانے سے کچھ نہیں بنے گا۔ آنسو گولیاں نہیں روک سکتے بیوقوف واری زینو۔ تو نے سر میں گولی کھائی ہے۔ تو کیا اب پیٹ بھی چھلنی کرائے گی؟ لیٹ جا کمینی۔"

تھک ہار کر جب وہ زمین پر ہی سو گیا اور زینو نے آس پاس چارپائیاں کھڑی کر کے اس پر سایہ کر دیا اور اس کے سر کے نیچے تکیہ لا کر رکھ دیا۔ تو ایک پڑوسن نے دیوار سے جھانک کر کہا۔ "زینو بہن۔ اس سے تو وریام کہیں وہیں لام میں ہی مر جاتا تو اچھا تھا۔"

زینو آپے سے باہر ہو کر گالیوں کا طومار باندھتی ہوئی اٹھی اور پڑوسن کے ماتھے پر تڑاق سے وہی گلاس دے مارا جس نے اس کے سر

کوزخمی کیا تھا۔ پڑوسن گلاس سمیت دوسری طرف گری اور پھر محلے بھر میں کہرام مچ گیا۔ لوگوں نے زخمی عورت کے عزیزوں کو بمشکل زینو سے بدلہ لینے سے روکا۔ اور جب روتی ہوئی زینو نے بھی پڑوسن سے جا کر معافی مانگ لی اور اپنا گلاس اٹھا کر جانے لگی تو زخمی پڑوسن بھی رودوی اور بولی۔ ''ہمارے بھرے پرے پڑوس کو اجڑا سمجھو۔ یہ زینو بھی ادھر ہی جا رہی ہے جدھر وریام جا چکا ہے۔ بے چارے بدنصیب۔''

شام کی گاڑی بھی لمبی سیٹی بجاتی ہوئی آئی اور گزر گئی۔ مگر بہرام کی آنکھ نہ کھلی۔ زینو شام تک تو اس کے پاس بیٹھی آتی جاتی چیونٹیوں کے رخ بدلتی رہی تا کہ وہ وریام کو پریشان نہ کریں مگر جھٹپٹے کے بعد اس نے وریام کو آج پہلی بار جگانے کی کوشش کی۔

''کیا؟'' وہ بولا۔ زینو نے کہا۔ ''اندر آ جاؤ۔ ٹھنڈ پڑنے لگی ہے۔'' وریام ''چلو۔'' کہہ کر اٹھا اندر آ کر ایک چارپائی پر گرا اور یوں سو گیا جیسے جاگا ہی نہیں تھا۔

آدھی رات کو اس کی آنکھ کھلی تو بچہ سو رہا تھا اور زینو چراغ کی میلی زرد روشنی میں بیٹھی وریام کا سر دبا رہی تھی۔ وہ اٹھا۔ زینو کو بہت سے پیار کئے اس کے سر پر بندھی ہوئی پٹی کو چھوا تو بولا۔ ''یہ کیا ہے؟'' اور جب زینو نے اسے دن کا واقعہ سنایا تو وہ اس کے زانو پر سر رکھ کر رونے لگا اور بولا۔ ''سچ مچ اگر میں مر ہی جاؤں تو کچھ زیادہ نہیں بگڑے گا۔''

زینو اچانک نچڑ کر رہ گئی مگر پھر جیسے اپنے آپ سے لڑ کر مسکرا دی اور بولی۔ ''مر تو جاؤ پر کہیں سے ہیرا بھی تو ملے۔ تم ہی نے تو کہا تھا کہ شان سے مرنا ہے تو ہیرا چاٹ کر مرو۔''

وریام بچوں کی طرح بہل گیا۔ بولا۔ ''سچ مچ زینو۔ کہیں سے مجھے ہیرا لا دو۔ چلو طے پایا کہ جب تک تم کہیں سے ہیرا نہیں لا تیں میں مروں گا نہیں۔ سنا ہے جاگیردار کی نئی بیوی کی ہر انگلی میں ایک ایک ہیرا ہے۔ کبھی جانا اس کے پاس۔ کہنا۔ ایک انگوٹھی دے دو۔ ابھی واپس کر دوں گی۔ بس وریام کو اسے ذرا سا چاٹنا ہے۔''

دونوں بے اختیار ہنسنے لگے۔ وریام تو اس کے بعد سو گیا۔ لیکن زینو جاگتی رہی۔ وہ ویسے بھی راتوں کو جاگتی رہتی تھی۔ اس کا سارا اثاثہ ختم ہو چکا تھا اور وہ جاگیردار اور دوسرے بڑے گھروں میں چکی پیس کر پانی بھر کر اور کپڑے دھو کر گھر بھر کا پیٹ پال رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں پر گٹے پڑ گئے تھے۔ اس کے بال ہر وقت اجڑے رہتے تھے اور وہ سوتے وقت کراہتی تھی۔ وہ بہرام کو ساتھ لے کر باہر چلی جاتی اور محنت مزدوری کر کے واپس آ جاتی۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ وریام گھر سے نہیں نکلے گا کیونکہ جب وہ بیمار ہوتا تھا تو چارپائی سے گر کر زمین سے چمٹ جاتا تھا اور ہوش میں تو وہ بچوں تک سے نظریں ملانے سے کتراتا تھا اور اسی لئے گھر میں دبکا پڑا رہتا تھا۔

ایک دن زینو واپس گھر میں آئی تو اس کے سر پر ایک بڑا سا چمکتا ہوا برتن تھا اور بہرام نے بھی اپنے دونوں ہاتھوں میں ایک پوٹلی سی اٹھا رکھی تھی۔ وریام نے پلٹ کر دیکھا اور بولا۔ ''آ گئیں زینو؟''

''ہاں۔'' وہ بولی۔ کیا کرتے رہے؟''

''گنگناتا رہا۔'' وریام بولا۔ آج تو مجھے بڑے پرانے پرانے گیت یاد آتے رہے۔ وہ گیت بھی جو تم نے بیری پر چڑھی ہوئی سہیلیوں کے ساتھ مل کر گایا تھا اور جب میں نیچے سے گزرا تھا تو سہیلیوں نے تم سے کہا تھا۔ جب کرری۔ نیچے تیرا ہوتا سوتا جا رہا ہے۔ یاد

ہے؟ان دنوں ہماری تازہ تازہ منگنی ہوئی تھی اور میں کتنی بار جان بوجھ کرتمہارے پاس سے ہوکرگزرتا تھا۔یاد ہے نا؟''

''یاد ہے۔''زینو بولی۔''یہی یادیں تو جینے کی مٹھاس ہیں۔''

وریام کے چہرے پر رونق آ گئی۔اس نے بہرام کو اپنے پاس بلا کر بٹھالیا اور اسے کوئی کہانی سنانے لگا۔تھوڑی دیر کے بعد زینو کھانا لے کر آئی اور وریام کے سامنے چن دیا۔وریام سب سے پہلے پلاؤ کھانے لگا۔بہرام نے حلوے کی رکابی پر ہلہ بول دیا۔زینو نیچے بیٹھی مکھیاں جھلتی رہی اور دونوں کو باری باری بڑے پیار سے دیکھتی رہی۔اس بار اس نے بچے کو ڈانٹا۔ارے آرام سے کھالڑکے۔آدھا کھاتا ہے آدھا گراتا ہے۔ایسا حلوہ روز روز تھوڑی ملے گا۔''

''حلوہ بھی ہے؟''وریام نے حیران ہو کر پوچھا۔پھر وہ مسکرا کر بولا۔''آج تو زینو نے گھر کو آگ لگادی ہے۔یہ پلاؤ تو بڑا ہی مزیدار ہے۔کتنا اچھا پکایا ہے تم نے۔''

''میں نے تو نہیں پکایا۔''زینو بولی۔

''تو پھر کس نے پکایا ہے؟''وریام نے ایک اور نوالہ بناتے ہوئے پوچھا۔

''جانے کس نے پکایا ہے۔'وہ بولی۔میں تو جاگیردار کے گھر سے لائی ہوں۔''

''کیوں؟''وریام نے نوالہ رکابی ہی میں رکھ دیا۔

''آج اس کے بیٹے کا چالیسواں تھا۔''

''چالیسواں چھوڑ پچاسواں ہو پر وہ لوگ ہمارے کیا لگتے ہیں؟''

''کچھ نہیں۔''

''تجھے کیوں دیا یہ پلاؤ اور یہ حلوہ؟''

''بس دے دیا وریام غصے نہ ہو۔''زینو نے التجا کی۔

FRIENDSKORNER.COM

میں پوچھتا ہوں کیوں دیا؟''وریام نے پلنگ پر سے ٹانگیں لٹکا لیں اور بہرام نے رونے کی تیاری میں نچلا ہونٹ لٹکا دیا۔''کیوں دیا؟''وریام گرجا۔

''بس غریب جان کر دے دیا۔''زینو نے آہستہ سے کہا۔

''مطلب یہ کہ جاگیردار نے خیرات دی؟''

''ہاں۔''

''اور تم نے لے لی؟''

زینو خاموش رہی۔

''اپنے بیٹے کی آنکھوں میں پیاس دیکھ رہی ہو؟''

زینو پھر خاموش رہی۔

''مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ آج کل بھیک کھا رہے ہیں۔''

زینو اں تک اس لئے خاموش تھی کہ اسے وریام پر پاگل پن سوار ہونے کا یقین ہو گیا تھا مگر جب اس نے دیکھا کہ اس میں ایسے کوئی آثار پیدا نہیں ہو رہے تو وہ ٹوٹ کر رو دی اور بولی۔ ''وریام پیارے۔ میرے پاس دست غیب تو نہیں ہے۔ کہ ہر صبح کی نماز کے بعد مصلے کے نیچے سے پانچ روپے نکال لوں آج ایک سال سے تمہاری پنشن کا کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ اور وریام میں نے تو وہ مرادآبادی پرتن تک بیچ ڈالے ہیں جو تم نے بریلی سے خریدے تھے۔ ان میں سے ایک یہی گلاس باقی رہ گیا ہے جس میں ہم پانی پیتے ہیں اور ایک دوسرے کے سر بھی پھوڑتے ہیں۔ تو پھر بتاؤ وریام میں اور کیا کروں؟'' ''تمہیں پتہ نہیں پر میں نے چکی پیسی ہے۔ میں نے پانی بھرا ہے۔ میں نے کپڑے دھوئے ہیں۔ تم نے مجھ سے یہ بھی کبھی نہیں پوچھا۔ کہ باہر جا کر اتنی دیر کیا کرتی رہتی ہو۔ تم نے مجھ سے یہ بھی کبھی نہیں کہا۔ اجڑے بالوں میں کنگھی کر لو۔ میں نے محنت مزدوری کے بعد بدلے میں چٹکی بھر آٹا پایا ہے تو گھر آئی ہوں اور توے پر تمہارے اور بہرام کے لئے ایک روٹی ڈالی ہے۔ اور خود بھوکی رہی ہوں۔ وہ تمہاری لائی ہوئی رنگوں کی قمیص دس روپے میں بیچ کر میں سائیں سبز شاہ کے روضے پر کڑاہی چڑھائی تھی۔ اب کے عید میں جو تم نے نئی پگڑی باندھی ہے تو یہ میرے آخری کنگن کی قیمت تھی۔ بھلا بتاؤ تو میں نے جو یہ چادر اوڑھ رکھی ہے تو یہ کہاں سے آئی ہے؟ وریام کے جو کرتے بنے ہیں تو وہ کہاں سے ملے؟ یہ سب گاؤں کے خدا ترسوں کی مہربانی ہے ورنہ وریام آج میں اور تم اور بہرام سب ننگے نظر آتے اور ہم یہیں اس چھپر تلے مارے بھوک کے سوکھ کر مر جاتے۔''

''مر جاتے تو اچھا تھا۔'' وریام بولا۔

پھر وہ اٹھا اور آنگن میں ٹہلنے لگا۔ جیئے تو کون سا تیر مار لیا۔ مر جاتے تو کیا بگڑ جاتا۔ تین نئے پتے شاخ پر پیدا ہوتے ہیں تو شاخ کے زیور نہیں سج جاتے۔ اور جب یہ تین پتے ٹوٹ کر گر پڑتے ہیں تو درخت لٹ نہیں جاتا۔ سمجھیں زینو؟ اور ہم نے تو خیر جوانی گزارنی تھی گزار لی۔ پر بہرام کو کبھی غور سے دیکھا ہے؟ اور جانتی ہو یہ نئے زمانے کا بچہ ہے۔ اسے تو بڑا ہو کر بڑے بڑے کام کرنے ہیں۔ ہم نے تو نوازی بوٹیوں کا ڈھیر دیکھا تو پاگل ہو گئے۔ پر اس نئے زمانے کے تاج الملوک کو تو بگلی، خون پسینے کے کتنے سمندر کاٹ کر خوشیوں کی بکاؤلی میں پھول لانا ہے جانتی ہو نیا زمانہ کتنا سخت ہے؟''

''میں کیا جانوں میرے لئے تو ہر زمانہ نیا ہے۔'' زینو ناگواری سے بولی۔

وریام نے زینو کے لہجے کی تھکن محسوس کر لی۔ بولا۔ بکاؤلی کی کہانی یاد ہے؟ نہیں؟ سناؤں؟ آؤ ادھر چارپائی پر آ جاؤ۔ ڈرو نہیں۔ آج میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آخر تر تراتا پلاؤ کھایا ہے۔''

وہ دیر تک زینو کو بکاؤلی کی کہانی سناتا رہا۔ بہرام زینو کی گود میں سو گیا تھا اور سائے ڈھل کر لمبے ہو رہے تھے۔ جب کہانی ختم ہو گئی تو

زینو بہرام کو ایک طرف لٹا کر اور وریام کے ماتھے پر ہلکا سا پیار کر کے مکان کے اندر دہلیز کے پاس برتن دھونے بیٹھ گئی۔ اور جب وہ برتن دھو چکی تو بولی۔ ''وریام۔ وعدہ کرتی ہوں۔ اب خیرات نہیں لوں گی۔ خیرات لوں تو ہیرا چاٹوں۔''

زینو نے مسکرا کر چھپر کی طرف دیکھا مگر وریام وہاں موجود نہ تھا۔ پھر اس نے وریام کو نہ جانے کیوں اس زور سے پکارا کہ بہرام چیخ کر جاگ اٹھا۔ بہرام کو کولھے پر بٹھا کر وہ باہر بھاگ گئی۔

وریام اپنے گھر اور اسٹیشن کے درمیان شاہ کیکر کے تنے سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ زینو لپک کر اس کے پاس گئی تو وہ بولا۔ ''کیوں زینو۔ کیا بات ہے؟'' ''تم تو بالکل چٹی دھجی ہو رہی ہو۔''

زینو بولی۔ ''تم یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟''

وریام نے مسکرا کر کہا۔ ''کچھ نہیں بس ذرا ریک گاڑی کا انتظار کر رہا تھا کہ وہ آئے تو اس کے آگے لیٹ جاؤں۔''

زینو وریام کی شگفتگی کے باوجود سناٹے میں آ گئی۔ پھر اس نے وریام کا بازو پکڑ کر اسے گھر کی طرف کھینچنا شروع کیا۔ ''ایسی باتیں نہ بکا کرو۔''

''تم ہیرا لا کے تو دیتی ہی نہیں۔'' وریام اسی لہجے میں بولا اور زینو کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اور پھر اس نے بہرام کو اس کے بازوؤں سے لے کر اپنے کندھے پر بٹھا لیا اور جب گھر میں داخل ہوا تو بہرام کو اتار کر بولا۔ ''آج سے میں کام کروں گا زینو۔ چاہے مجھے سائیسی ہی کیوں نہ کرنی پڑے پر زینو اور بہرام کو حلال کی کمائی کھلاؤں گا۔ میں تمہیں یوں گلیوں میں۔۔۔۔۔۔''

اچانک دروازہ کھلا اور ایک میراثن اندر آئی۔ بولی۔ ملکانی کہہ رہی ہیں بہت سا گوشت بھی بچ گیا ہے آ کے لے جاؤ۔''

وریام تڑپ کر بولا۔ ''ملکانی سے کہو کتوں کے آگے ڈال دیں۔''

میراثن تڑپ کر بولی۔ ''ہم بھی تو کتے ہیں وریام خاں۔ غریب آدمی بھی تو گلی کا آوارہ کتا ہی ہوتا ہے۔''

وریام جیسا بیٹھا تھا، بیٹھا رہ گیا۔

زینو نے میراثن کو اشارہ کیا اور اسے مکان کے اندر لے گئی۔ اس سے دیر تک کچھ باتیں کرتی رہی۔ پھر دونوں وہیں بیٹھ کر جاگیردار کے دھلے ہوئے برتنوں کو کپڑے سے رگڑ رگڑ کر چمکانے لگیں اور بچہ ان کے پاس بیٹھا مٹی کھاتا رہا۔

میراثن کو برتن دے کر زینو بولی۔ چپکے سے نکل جا۔ وریام کچھ بولے بھی تو کچھ نہ کہنا۔ پہلے بھی آتے ہی تم نے اتنی بڑی بات بک دی۔ اسے کچھ ہو جاتا تو؟ جب وہ سو جائے گا تو میں۔۔۔۔ ٹھہر جا میں دیکھ تو لوں وریام کس طرف دیکھ رہا ہے۔

اس نے باہر جھانکا اور بولی۔ ''نکل چل۔ اس وقت نہیں ہے۔''

میراثن جھپ سے باہر نکل گئی۔

بہرام کے مٹی بھرے منہ کو صاف کر کے زینو نے اسے اٹھایا اور باہر آنگن میں ادھر ادھر دیکھا اور دو پھر ایک دم اس زور سے بھاگ

نکلی کہ بہرام اس کے کولہے پر ہر قدم پر اچھل اچھل جاتا تھا۔وہ شاہ کیکر کے پاس سے بھی نکل گئی۔ادھر سے بہت سے لوگ آرہے تھے۔جب وہ ان کے پاس پہنچی تو رکی نہیں۔صرف اتنا پوچھ لیا۔ادھر کہیں وریام تو۔۔۔۔۔۔۔۔"

پھر وہ انہی قدموں پر رک گئی اور لوگوں کے چہروں پر نظریں گاڑے کھڑی رہی اچانک وہ بہرام کو سینے سے چمٹا کر ڈراؤنی چیخیں مارتی ہوئی بھاگی مگر وہ پلیٹ فارم پر دیر سے پہنچی تھی۔اس وقت قلی گاڑی کے پہیوں سے وریام کے چھڑے کو الگ کر کے بیلچوں کے سہارے کھڑے چپ چاپ رو رہے تھے۔اور اسٹیشن ماسٹر مولوی عبدالرب انجن ڈرائیور سے کہہ رہے تھے۔"مرنے کے لئے بھی ایک سلیقہ چاہئے، یہ نہیں کہ۔۔۔۔۔"

FRIENDS KORNER
FRIENDSKORNER.COM